دَھنک

اُردو کور کی معاون درسی کتاب

بارھویں جماعت کے لیے

5287

विद्ययाऽमृतमश्नुते

एन सी ई आर टी
NCERT

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

© NCERT not to be republished

Dhanak, Supplementary Reader
of Urdu Core Course for class XII

ISBN 978-93-5007-181-6

پہلا اردو ایڈیشن

نومبر 2011 اگہن 1933

دیگر طباعت

اپریل 2019 چیتر 1941

PD 2H SPA

© نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ 2011

قیمت: ₹ ??.00

این سی ای آر ٹی واٹر مارک 80 جی ایس ایم کاغذ پر شائع شدہ
سکریٹری، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ،
شری اروندو مارگ، نئی دہلی نے
میں
چھپوا کر پبلی کیشن ڈپارٹمنٹ سے شائع کیا۔

جملہ حقوق محفوظ

- ناشر کی پہلے سے اجازت حاصل کیے بغیر، اس کتاب کے کسی بھی حصے کو دوبارہ پیش کرنا، یادداشت کے ذریعے بازیافت کے سسٹم میں اس کو محفوظ کرنا یا برقیاتی، میکانیکی، فوٹو کاپینگ، ریکارڈنگ کے کسی بھی وسیلے سے اس کی ترسیل کرنا منع ہے۔
- اس کتاب کو اس شرط کے ساتھ فروخت کیا جا رہا ہے کہ اسے ناشر کی اجازت کے بغیر، اس شکل کے علاوہ جس میں کہ یہ چھاپی گئی ہے یعنی، اس کی موجودہ جلد بندی اور سرورق میں تبدیلی کر کے، تجارت کے طور پر نہ تو مستعار دیا جا سکتا ہے، نہ دوبارہ فروخت کیا جا سکتا ہے، نہ کرایہ پر دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی تلف کیا جا سکتا ہے۔
- کتاب کے صفحہ پر جو قیمت درج ہے وہ اس کتاب کی صحیح قیمت ہے۔ کوئی بھی نظر ثانی شدہ قیمت چاہے وہ ربر کی مہر کے ذریعے یا چپچی یا کسی اور ذریعے ظاہر کی جائے تو وہ غلط متصور ہوگی اور ناقابل قبول ہوگی۔

این سی ای آر ٹی کے پبلی کیشن ڈپارٹمنٹ کے دفاتر

این سی ای آر ٹی کیمپس
شری اروندو مارگ
نئی دہلی - 110016 **فون** 011-26562708

108,100 فٹ روڈ ہوسڈے کیرے ہیلی
ایکسٹینشن بناشنکری III اسٹیج
بنگلور - 560085 **فون** 080-26725740

نوجیون ٹرسٹ بھون
ڈاک گھر، نوجیون
احمد آباد - 380014 **فون** 079-27541446

سی ڈبلیو سی کیمپس
بمقابل ڈھانکل بس اسٹاپ، پانی ہاٹی
کولکتہ - 700114 **فون** 033-25530454

سی ڈبلیو سی کامپلیکس
مالی گاؤں
گواہاٹی - 781021 **فون** 0361-2674869

اشاعتی ٹیم

ہیڈ، پبلی کیشن ڈویژن	:	محمد سراج انور
چیف ایڈیٹر	:	شویتا اُپّل
چیف پروڈکشن آفیسر	:	ارون چتکارا
چیف بزنس منیجر	:	ابیناش کُلّو
ایڈیٹر	:	سید پرویز احمد
پروڈکشن آفیسر	:	عبدالنعیم

© NCERT not to be republished

پیش لفظ

’قومی درسیات کا خاکہ–2005‘ میں سفارش کی گئی ہے کہ بچّوں کی اسکولی زندگی، ان کی باہر کی زندگی سے ہم آہنگ ہونی چاہیے۔ یہ زاویۂ نظر کتابی علم کی اُس روایت کی نفی کرتا ہے جس کے باعث آج تک ہمارے نظام میں اسکول، گھر اور سماج کے درمیان فاصلے حائل رہے ہیں۔ نئے قومی درسیات پر مبنی نصاب اور درسی کتابوں کی تیاری اسی بنیادی مقصد پر عمل آوری کی ایک کوشش کہی جا سکتی ہے۔ اس کوشش میں مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے اور رٹ کر پڑھنے کے طریقۂ کار کی حوصلہ شکنی بھی شامل ہے۔ ہمیں امّید ہے کہ ان اقدامات سے قومی تعلیمی پالیسی (1986) میں مذکور تعلیم کے ’طفل مرکوز نظام‘ کی طرف مزید پیش رفت ہوگی۔

اس کوشش کی کامیابی کا انحصار ان اقدامات پر ہے کہ اسکولوں کے پرنسپل اور اساتذہ اپنے تاثرات خود ظاہر کرنے اور ذہنی سرگرمیوں اور سوالوں کے ذریعے سیکھنے کے سلسلے میں بچوں کی ہمّت افزائی کریں۔ ہمیں یہ ضرور تسلیم کرنا چاہیے کہ بچّوں کو اگر موقع، وقت اور آزادی دی جائے تو وہ بڑوں سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر نئی معلومات مرتّب کرتے ہیں۔ آموزش کے دوسرے ذرائع اور محلِ وقوع کو نظر انداز کرنے کے بنیادی اسباب میں سے ایک اہم سبب، مجوّزہ نصابی کتاب کو امتحان کے لیے واحد ذریعہ بنانا ہے۔ بچّوں کے اندر تخلیقی صلاحیت اور پیش قدمی کے رجحان کو فروغ دینا اُسی وقت ممکن ہے جب ہم آموزشی عمل میں بچّوں کو بہ حیثیت شریک کار قبول کریں اور ان سے اُسی طرح پیش آئیں۔ انھیں محض مقرّرہ معلومات کا جانکار نہ سمجھیں۔

یہ مقاصد اسکول کے نظام الاوقات (Time-Table) اور طریقۂ کار میں معقول تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ روز مرّہ معمولات میں نرمی کی اتنی ہی اہمیت یا ضرورت ہے جتنی کہ سالانہ کیلینڈر کے نفاذ میں سخت محنت کی، تاکہ تدریس کے لیے دستیاب مدّت کو حقیقتاً تدریس کے لیے وقف کیا جا سکے۔ تدریس اور اندازِ قدر کے طریقوں سے بھی اس امر کا تعیّن ہوگا کہ یہ نصابی کتاب بچّوں میں ذہنی تناؤ اور اکتاہٹ پیدا کرنے کے بجائے ان کی اسکولی زندگی کو خوش گوار بنانے میں کس حد تک موثّر ثابت ہوتی ہے۔ نصابی بوجھ کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے نصاب سازوں نے مختلف سطحوں پر معلومات کی تشکیلِ نو اور اُسے نیا رخ دینے کی غرض سے بچوں کی نفسیات اور تدریس کے لیے دستیاب وقت پر زیادہ سنجیدگی کے ساتھ توجہ دی ہے۔ اس مخلصانہ کوشش کو مزید

© NCERT not to be republished

بہتر بنانے کے لیے یہ نصابی کتاب سوچنے اور حیرتوں کو جگائے رکھنے، چھوٹے گروپوں میں بحث و مباحثہ کو فروغ دینے اور عملاً انجام دی جانے والی سرگرمیوں کو زیادہ اوّلیت دیتی ہے۔

این سی ای آر ٹی اس کتاب کے لیے تشکیل دی جانے والی ''کمیٹی برائے درسی کتاب'' کی مخلصانہ کوششوں کی شکر گزار ہے۔ کونسل مشاورتی کمیٹی برائے زبان کے چیئرمین پروفیسر نامور سنگھ اور اس کتاب کے خصوصی صلاح کار پروفیسر شمیم حنفی کی ممنون ہے۔ اس درسی کتاب کی تیاری میں جن اساتذہ نے حصّہ لیا، ہم ان کے متعلقہ اداروں کے بھی شکر گزار ہیں۔ ہم ان سبھی اداروں اور تنظیموں کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنے وسائل، مآخذ اور عملے کی فراہمی میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ ہم وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، حکومتِ ہند کے شعبے برائے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کی جانب سے پروفیسر مرنال مری اور پروفیسر جی پی دیش پانڈے کی سربراہی میں تشکیل شدہ نگراں کمیٹی (مانیٹرنگ کمیٹی) کے اراکین کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت اور تعاون ہمیں دیا۔ باضابطہ اصلاح اور اپنی اشاعت کے معیار کو مسلسل بہتر بنانے کے مقصد کی پابند ایک تنظیم کے طور پر این سی ای آر ٹی تمام مشوروں اور آرا کا خیر مقدم کرتی ہے تاکہ کتاب کو مزید غور و فکر کے بعد اور زیادہ کارآمد اور بامعنی بنایا جاسکے۔

نئی دہلی
مارچ 2011

ڈائریکٹر
نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

© NCERT not to be republished

اس کتاب کے بارے میں

جدید ہندوستانی زبانوں میں اردو کو خاص مقام حاصل ہے۔ یہ زبان ملک کی مختلف ریاستوں میں بولی، سمجھی اور پڑھی جاتی ہے۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت بھی اردو کی تعلیم پر توجہ دی جاتی ہے۔

کونسل کے ذریعے تیار کردہ 'قومی درسیات کا خاکہ -2005 ' کی سفارشات کے مطابق مادری زبان کی تعلیم کے لیے پہلی جماعت سے بارھویں جماعت تک اردو میں درسی اور معاون درسی کتب، ثانوی زبان کی تعلیم کے لیے چھٹی جماعت سے دسویں جماعت تک اور تیسری زبان کی تعلیم کے لیے ساتویں سے دسویں جماعت تک اردو میں نئی درسی کتابیں پہلے ہی مہیا کی جا چکی ہیں۔ اب کونسل نے کور(Core)اردو کی درسی کتب اور معاون درسی کتب تیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

'قومی درسیات کا خاکہ -2005' کے تحت پیش کی جانے والی نثری اصناف پر مشتمل یہ کتاب یعنی ''دھنک'' (اردو کور کی معاون درسی کتاب)بارھویں جماعت کے طالب علموں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اس کتاب کا خاص مقصد طلبا کو زبان اور ادب سے واقف کرانا ہے تاکہ وہ مطلوبہ معیار کے مطابق صحیح اردو پڑھنا، بولنا اور لکھنا سیکھ جائیں۔ اس کتاب میں ایسے اسباق شامل ہیں جن کے مطالعے سے انسان دوستی، فرض شناسی، حب الوطنی، قومی یک جہتی اور خوش حال زندگی سے متعلق جذبات فروغ پا سکیں۔ امید ہے اس کتاب کے مطالعے سے طلبا میں صحیح اردو سننے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے نیز خیالات کے اظہار کی خاطر خواہ صلاحیت پیدا ہو سکے گی۔

© NCERT not to be republished

کمیٹی برائے درسی کتاب

چیئرمین، مشاورتی کمیٹی برائے زبان

نامور سنگھ، پروفیسر ایمیریٹس، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

خصوصی صلاح کار

شمیم حنفی، پروفیسر ایمیریٹس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

چیف کوآرڈی نیٹر

رام جنم شرما، سابق پروفیسر اینڈ ہیڈ، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن ان لینگویجیز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

اراکین

ارتضیٰ کریم، پروفیسر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

اقبال مسعود، سابق جوائنٹ سکریٹری، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال

انیس اشفاق، پروفیسر، شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

جاوید اختر وارثی، ٹی جی ٹی، اردو، گورنمنٹ بوائز سینئر سیکنڈری اسکول، دریا گنج، نئی دہلی

سراج اجملی، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

شمیم احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، سینٹ اسٹیفن کالج، دہلی

شہپر رسول، پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

عتیق اللہ، پروفیسر (ریٹائرڈ) دہلی یونیورسٹی، دہلی

غزالہ پروین، ٹی جی ٹی، اردو، خدیجۃ الکبریٰ گرلس پبلک اسکول، جوگا بائی ایکسٹنشن، نئی دہلی

قاسم خورشید، ہیڈ بہار، ایس سی ای آر ٹی، پٹنہ

قمر سلیم، سینئر لیکچرار، انجمن اسلام، اکبر پیر بھائی کالج آف ایجوکیشن، نوی ممبئی

© NCERT not to be republished

محمد عارف جنید، لیکچرار، ڈی آئی ای ٹی، بھوپال

ممبر کوآرڈی نیٹر

محمد نعمان خاں، (ریٹائرڈ) پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن ان لینگویجیز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی
محمد معظم الدین، پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن ان لینگویجیز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

© NCERT not to be republished

اظہارِ تشکر

اس کتاب کی تیاری میں ڈی ٹی پی آپریٹر محمد عارف رضا اور فلاح الدین فلاحی نے دل چسپی سے حصہ لیا ہے۔ کونسل ان کا شکریہ ادا کرتی ہے۔

© NCERT not to be republished

ترتیب

- پیش لفظ iii
- اس کتاب کے بارے میں v

افسانہ

عقل بڑی یا بھینس		(لوک کہانی)	02-05
تین سوال	(ترجمہ)	لیو ٹالسٹائی	06-11
بوڑھی کاکی		پریم چند	12-20

ناول

مرزا ظاہردار بیگ	(اقتباس)	ڈپٹی نذیر احمد	21-29
صف شکن بٹیر	(اقتباس)	پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ	30-38

انشائیہ

چڑیا، چڑے کی کہانی		ابوالکلام آزاد	39-48
انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا		محمد حسین آزاد	49-54

خاکہ

چچی		اسلم پرویز	55-61

سفر نامہ

دیارِ حبیب		صالحہ عابد حسین	62-68

ڈراما

مرزا غالبؔ		ابراہیم یوسف	69-77

مضمون

حضرت عائشہؓ کی سیرت کے چند پہلو		سید سلیمان ندوی	78-81
رابندر ناتھ ٹیگور		(ادارہ)	82-85

© NCERT not to be republished

گاندھی جی کا طلسم

میں تمھیں ایک طلسم دیتا ہوں۔ جب بھی تم شک و شبہ میں مبتلا ہو جاؤ یا تمھارا نفس تم پر حاوی ہونے لگے تو اس تجربہ کو آزماؤ:

جو سب سے غریب اور کمزور آدمی تم نے دیکھا ہو اُس کی شکل یاد کرو اور اپنے آپ سے پوچھو کہ جو قدم اُٹھانے کے بارے میں تم سوچ رہے ہو وہ اُس آدمی کے لیے کتنا مفید ہوگا۔ کیا اس سے اُسے کچھ فائدہ پہنچے گا؟ کیا اس سے وہ اپنی زندگی اور مقدر پر کچھ قابو پا سکے گا؟ دوسرے لفظوں میں کیا اس سے اُن کروڑوں لوگوں کو سوراج مل سکے گا جن کے پیٹ بھوکے اور رُوحیں بے چین ہیں۔

تب تم دیکھو گے کہ تمھارا شبہ مٹ رہا ہے اور نفس زائل ہو رہا ہے۔

مو . کہ . گاندھی

© NCERT not to be republished

افسانہ

افسانہ اردو ادب کی ایک مشہور صنف ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ دینے اور دماغی طور پر مصروف رہنے والوں کے لیے 'مختصر افسانہ' ناول اور داستان سے زیادہ کشش رکھتا ہے۔ مختلف نقّادوں نے افسانے کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں۔ ایک نقّاد نے کہا ہے کہ افسانہ ایسی نثری کہانی ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جا سکے۔ ایک اور نقاد کا کہنا ہے کہ افسانے میں بنیادی چیز وحدتِ تاثّر ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ افسانے کے فن میں بھی تبدیلی آئی ہے۔

ایک اچھا افسانہ اختصار کے ساتھ زندگی کے کسی گوشے کو قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ مختصر ہونے کی وجہ سے افسانے میں جھول ہونے کے امکانات بھی کم ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار کا مشاہدہ اور انسانی نفسیات کا مطالعہ گہرا ہونا چاہیے۔ کردار ایسے ہوں جو ہماری زندگی اور ہمارے تجربوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔

اردو کے افسانہ نگاروں میں پریم چند، علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، غلام عباس، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین بہت اہم ہیں۔ ان کے بعد نئے افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد بھی سامنے آ چکی ہے۔

© NCERT not to be republished

عقل بڑی یا بھینس

5287CH01

چھتّیس گڑھ کے علاقے میں ایک بہت گھنا جنگل تھا۔ اس کے ایک حصّے میں نہایت صاف اور شفّاف پانی کا ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس میں خوبصورت کنول کھلے ہوئے تھے۔ تالاب کے کنارے اونچے اونچے درخت تھے جن پر بہت سے پرندے رات کو بسیرا کرتے اور صبح ہوتے ہی دانہ پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر اُڑ جاتے تھے۔ وہیں کچھ بگلے بیٹھتے، کچھ پانی پر اُڑتے پھرتے اور کچھ بگلے اور سارس اپنے لیے شکار کی تلاش میں کنارے کنارے گھومتے پھرتے تھے۔

کچھ دن بعد ایک بھینس بھی نہانے کی غرض سے اس تالاب میں آنے لگی۔ وہ دن بھر پانی میں تیرتی یا کنارے پر آرام کرتی اور شام ہوتے ہی اپنے گاؤں لوٹ جاتی۔ جس جگہ بھینس نہاتی وہاں کا پانی گندا اور مٹ میلا ہو جاتا تھا جس سے بگلوں اور سارسوں کو مچھلیاں پکڑنے میں بڑی دشواری ہوتی تھی۔

ایک دن بھینس نے تالاب کا پانی کچھ زیادہ ہی گندا کر دیا۔ اس پر ایک سارس نے بڑی عاجزی اور انکسار کے ساتھ اپنی لمبی گردن جُھکا کر بھینس سے کہا، ”بہن! ہم کئی دنوں سے بہت کم شکار کر پائے ہیں۔ آج تو آپ نے پورے تالاب کو ہی گندا کر ڈالا“۔

یہ سنتے ہی بھینس آگ بگولا ہوگئی اور غصّے سے سر اُٹھا کر بولی، '' گستاخ! یہی کیا کم ہے کہ میں تم جیسے لوگوں کو اس تالاب سے مچھلیاں پکڑ لینے دیتی ہوں۔'' بے چارہ سارس اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔مگر بگلا خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے جواب دیا،'' اس تالاب پر تو جنگل کے تمام چرند و پرند کا یکساں حق ہے۔ البتہّ آپ خدا جانے کہاں سے آٹپکی ہیں.....''

بھینس نے کڑک کر کہا،'' بدتمیز! میں یہاں کی مہارانی ہوں۔ جیسے میرا دل چاہے گا ویسے نہاؤں گی۔'' بھینس کی یہ پُر غرور باتیں سن کے بگلے کو بھی غصہّ آ گیا۔ اس نے اپنے پروں کو پھڑ پھڑایا اور ایک ٹانگ پر کھڑا ہوکر بولا،'' مہارانی جی! آپ شاید اپنے ڈیل ڈول اور اپنی طاقت پر مغرور ہیں، تو ہمیں بھی خدا نے عقل دی ہے، خدا گنجے کو ناخون نہیں دیتا.....'' بھینس بھلا بگلے کی یہ طنز بھری بات کیسے برداشت کر لیتی۔ وہ پانی سے باہر نکلتے ہوئے بولی،'' ٹھہر کم بخت! میں بتاتی ہوں تجھے۔ بڑا بگلا بھگت بنا پھرتا ہے۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔'' بھینس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بگلا فوراً ایک پیڑ پر جا بیٹھا اور وہیں سے جلی کٹی سُنا تا رہا۔ بھینس پرندہ تو تھی نہیں جو اُڑ کر بگلے کو پکڑتی اور سزا دیتی۔ وہ پیڑ کے نیچے کھڑی ہوئی فوں فاں کرتی رہی اور تھک ہار کر یہ کہتی ہوئی چلی گئی،'' ہونہہ! اِن کے منہ کون لگے۔'' بھینس کے جانے کے بعد ایک سارس نے بگلے سے کہا،'' بھائی! تم نے یہ اچھّا نہیں کیا۔ اب وہ سچ مچ ہمیں شکار کرنے نہیں دے گی۔'' بگلا بولا،'' دوستو! طاقت ہی سب کچھ نہیں ہوتی بلکہ عقل سے طاقت ور دشمن کو آسانی سے زیر کیا جاسکتا ہے۔ میں جلد ہی مہارانی جی کا پتّا کاٹ دوں گا۔''

سارس کو شاید بگلے کی بات کا یقین نہ آیا۔ اس نے کہا،'' اگر تمھیں یقین ہے تو ٹھیک ہے مگر مجھے تو یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔'' بگلے نے جواب دیا،'' میں ایسی چال چلوں گا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ آپ لوگ بےفکر رہیے۔'' اسی کے ساتھ تمام پرندے اپنے اپنے بسیروں کی طرف پرواز کر گئے۔ ان سب کے جانے کے بعد بگلے نے سوچا بات تو بگڑ ہی گئی ہے۔ خیر! اب خوشامد ہی ایسی ترکیب ہے جس سے بھینس کو رام کیا جاسکتا ہے۔ خوشامد سے بے وقوف مزید بے وقوف بن جاتا ہے۔ یہ سوچ کر بگلے نے دوسرے دن سے بھینس کو صبح شام بڑے ادب سے سلام کرنا شروع کر دیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس ترکیب پر عمل کرنے کو کہا۔ لیکن یہ ترکیب بھی زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوسکی۔ بگلے کو جلد ہی احساس ہوگیا کہ یہ دوستی یک طرفہ ہے۔ بھینس اب بھی ہم لوگوں کو حقیر سمجھتی ہے۔ لیکن فی الحال سوائے صبر کے کوئی چارہ نہ تھا۔

کچھ دن بعد بگلے کو بھینس سے بدلہ لینے کا موقع مل گیا۔ ہوا یہ کہ تالاب کے کنارے ایک بارات آکر رکی۔ دوپہر میں سب لوگوں نے آرام کیا اور شام کے وقت کچھ لوگ نہانے لگے۔ دولہا میاں نے بھی اپنے کپڑے اور سونے کا ہار اُتار کر ایک طرف رکھ دیا اور نہانے میں مشغول ہوگئے۔ اسی اثنا میں بگلے کی نظر ہار پر پڑی اس نے خوش ہوکر سوچا۔'' اہاّ! یہ موقع ہے مہارانی جی سے

بدلہ لینے اور سزا دلوانے کا۔'' وہ فوراً دولہا میاں کا ہار لے کر اُڑا۔ اسی وقت بھینس بھی تالاب سے نکل کر اپنے گاؤں کے لیے چل دی۔ بگلا تو بھینس کی تلاش میں تھا ہی، اسے دیکھتے ہی وہ بھینس کی پیٹھ پر جا بیٹھا اور بڑی ہوشیاری سے ہار کو اس کے سینگ میں الجھا کر ہنستا ہوا اُڑ گیا۔

ادھر جب دولہا میاں نہا کر فارغ ہوئے تو کپڑے پہنتے وقت معلوم ہوا کہ ہار غائب ہے۔ اس خبر سے بارات میں تہلکہ مچ گیا اور ہر طرف ہار کو تلاش کیا جانے لگا۔ دولہا کا بھائی اتّفاق سے اسی راستے پر جا نکلا جدھر بھینس جا رہی تھی۔ اچانک اس کی نگاہ بھینس کے سینگ میں اُلجھے ہوئے ہار پر پڑی تو وہ چونک پڑا اور اس نے بھینس کو روک کر اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔ کچھ لوگ اس طرف دوڑ پڑے۔ بس پھر کیا تھا بھینس پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہار تو اس کے سینگ سے نکال لیا گیا اور چاروں طرف سے اس پر ڈنڈوں کی برسات ہونے لگی۔ جیسے تیسے بے چاری اپنی جان بچا کر بھاگی۔ ہڈّیوں میں کافی چوٹیں آئی تھیں۔ وہ کراہتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ چلتے چلتے اچانک اسے خیال آیا کہ یہ ہار میرے سینگ میں آیا کیسے؟ میں نے تو اٹھایا نہیں تھا۔ بگلے کا خیال آتے ہی وہ سب کچھ سمجھ گئی۔

''ہو نہ ہو یہ کام اُسی بگلا بھگت کا ہے۔'' اسی وقت قریب کے ایک درخت سے بگلوں کے ہنسنے کی آوازوں نے اسے چونکا دیا۔ بگلا کہہ رہا تھا، ''کہیے مہارانی جی! کہاں گئی آپ کی وہ طاقت جس پر آپ کو اتنا گھمنڈ تھا۔ بڑے بول کا سر ہمیشہ نیچا رہتا ہے۔ دیکھا آپ نے ہماری عقل نے کیا کام کیا۔'' بگلے کی بات سُن کر بھینس بڑی شرمندہ ہوئی اور سر جھکا کر بولی، ''دوستو! مجھے معاف کر دو۔ میں آئندہ تمھاری دوست بن کر رہوں گی۔''

اس طرح بگلے اور بھینس کی ایسی دوستی ہوئی جو آج تک قائم ہے۔ بگلا آج بھی بھینس کی پیٹھ پر سواری کرتا ہے اور ہر وقت اسے سمجھاتا رہتا ہے لیکن بھینس کی سمجھ میں اب تک یہ بات نہ آسکی کہ عقل بڑی ہوتی ہے یا بھینس۔

(لوک کہانی)

© NCERT not to be republished

مشق

سوالات

1۔ بھینس نے سارس اور بگلے کو حقیر کیوں سمجھا؟

2۔ بھینس نے سارس کی عاجزی اور انکسار کا جواب کس انداز میں دیا؟

3۔ بگلا خاموش کیوں نہ رہا اور اس نے بھینس سے کیا کہا؟

4۔ بگلے نے بھینس سے کس طرح بدلہ لیا؟

5۔ اس کہانی کا مرکزی خیال کیا ہے؟

© NCERT not to be republished

لیو ٹالسٹائی

(1910-1828)

ٹالسٹائی کا شمار دنیا کے مشہور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ روسی ادب میں بحیثیت ناول نگار ان کا قد بہت بلند ہے۔ ٹالسٹائی روس کے ایک رئیس گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد 23 سال کی عمر میں روسی فوج میں بھرتی ہوگئے اور کریمین جنگ میں حصّہ لیا۔ اسی عرصے میں انھوں نے اپنا پہلا ناول ''بچپن'' لکھا جسے ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔ اس طرح اپنے پہلے ناول سے ٹالسٹائی کا شمار معروف ادیبوں میں ہونے لگا۔ اپنے باغیانہ خیالات کے لیے انھیں عتاب کا شکار بھی ہونا پڑا۔

ٹالسٹائی نے متعدّد ناول، کہانیاں اور ڈرامے لکھے۔ ان کے ناول 'جنگ اور امن' اور 'انّا کرینینا' کو عالمی ادب میں شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ ٹالسٹائی کو روسی سماج اور تہذیب کا مصوّر کہا جاتا ہے۔ انھوں نے روسی معاشرے کے جاگیردارانہ نظام کی تلخ حقیقتوں کو اپنے ناولوں میں بڑی فن کاری کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ ان کے ناول اور کہانیاں حقیقت نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کی تحریروں میں اصلاحی پہلو نمایاں ہے۔

© NCERT not to be republished

تین سوال

5287CH02

ایک بار ایک بادشاہ کے دل میں خیال آیا کہ اگر اُسے پہلے سے ہی یہ معلوم ہوجایا کرے کہ کسی کام کے شروع کرنے کا صحیح وقت کیا ہے، وہ کون مناسب لوگ ہیں جن کی رائے پر بھروسہ کیا جائے اور وہ کون لوگ ہیں جن سے بچا جائے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر اسے یہ معلوم ہوجایا کرے کہ وہ کون سا کام ہے جسے سب سے زیادہ ضروری سمجھا جائے تو اسے ناکامی کا منہ کبھی نہ دیکھنا پڑے۔

دل میں یہ خیال آتے ہی بادشاہ نے پوری سلطنت میں منادی کرادی کہ وہ اُس شخص کو ایک بڑا انعام دے گا جو اُسے یہ بتا سکے کہ ہر کام کے شروع کرنے کا صحیح وقت کیا ہے۔ بہت اہم لوگ کون ہیں، اور وہ کس طرح جان سکے کہ سب سے زیادہ ضروری کام کیا ہے، جو اُسے کرنا چاہیے۔

بادشاہ کے پاس بہت سے پڑھے لکھے لوگ آئے لیکن اُن سب نے بادشاہ کے سوالات کے مختلف جوابات دیے۔ جواب مختلف ہونے کی وجہ سے بادشاہ ان میں سے کسی کی بات نہ مان سکا اور نہ اس نے کسی کو انعام دیا لیکن چوں کہ وہ اپنے سوالات کے جوابات جاننے کے لیے اب بھی فکر مند تھا اس لیے اُس نے طے کیا کہ وہ ایک سادھو سے جو اپنی سوجھ بوجھ کی وجہ سے سلطنت کے کونے کونے میں مشہور تھا، مشورہ کرے گا۔

سادھو ایک جنگل میں رہتا تھا جس کے باہر وہ کبھی نہیں گیا تھا وہ عام آدمیوں کے علاوہ کسی سے نہیں ملتا تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے معمولی کپڑے پہنے اور سادھو کی کُٹیا سے پہلے ہی اپنے گھوڑے سے اتر پڑا۔ وہ اپنے سپاہیوں کو پیچھے چھوڑ کر سادھو سے ملنے کے لیے اکیلا چل پڑا۔

جب بادشاہ قریب پہنچا تو اس وقت سادھو اپنی کُٹیا کے سامنے زمین گوڑ رہا تھا۔ بادشاہ کو دیکھتے ہی اس نے اُسے سلام کیا اور زمین گوڑتا رہا۔ سادھو دُبلا پتلا اور کم زور تھا۔ ہر بار جب وہ اپنا پھاوڑا زمین پر چلاتا، بہت تھوڑی مٹی کھود پاتا اور بُری طرح ہانپنے لگتا۔

بادشاہ اس کے پاس گیا اور بولا، ’’عقل مند سادھو، میں تمھارے پاس اپنے تین سوالوں کے جواب لینے آیا ہوں۔ میں کیسے جان سکتا ہوں کہ صحیح کام کرنے کا صحیح وقت کیا ہے؟ وہ کون لوگ ہیں جن کی مجھے بہت ضرورت ہے تاکہ میں دوسروں کے مقابلے میں

© NCERT not to be republished

ان لوگوں پر زیادہ توجہ کرسکوں اور وہ کون سے معاملات ہیں جو بہت ضروری ہیں اور جن پر مجھے فوراً توجہ کرنی چاہیے؟''

سادھو نے بادشاہ کی بات سنی لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ اور پھر زمین گوڑنا شروع کردی۔

''تم تھک گئے ہو''۔ بادشاہ نے کہا،'' مجھے پھاوڑا دو، میں تھوڑی دیر تمھارا کام کروں گا۔''

''شکریہ''، سادھو نے کہا اور بادشاہ کو پھاوڑا دے کر زمین پر بیٹھ گیا۔

جب بادشاہ دو کیاریاں گوڑ چکا تو وہ ٹھہر گیا اور اس نے پھر اپنے سوال دہرائے۔ سادھو نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پھاوڑے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے اُس نے کہا،'' اب تم دم بھر آرام کرو اور مجھے تھوڑا کام کرنے دو۔'' لیکن بادشاہ نے اس کو پھاوڑا نہیں دیا اور زمین گوڑتا رہا۔ ایک گھنٹہ گزرا اور دوسرا بھی۔ سورج درختوں کے پیچھے چُھپنے لگا۔ بادشاہ نے آخر کار پھاوڑا زمین پر مارتے ہوئے کہا،'' عقل مند آدمی! میں تمھارے پاس اپنے سوالوں کے جواب لینے آیا تھا۔ اگر کوئی جواب نہیں دے سکتے تو کہہ دو، میں اپنے گھر لوٹ جاؤں۔''

''کوئی آدمی بھاگا ہوا آرہا ہے۔'' سادھو نے کہا،'' آؤ دیکھیں وہ کون ہے؟''

بادشاہ گھوما۔ اس نے ایک داڑھی والے آدمی کو جنگل سے بھاگ کر آتے ہوئے دیکھا۔ آدمی اپنے ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبائے ہوئے تھا اور خون اس کے ہاتھوں سے ٹپک رہا تھا۔ وہ کمزوری سے کراہتا ہوا بادشاہ کے پاس پہنچا اور زمین پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔ بادشاہ اور سادھو نے اس آدمی کے کپڑے کھولے۔ اس کے پیٹ میں ایک بڑا زخم تھا۔ بادشاہ نے جہاں تک ہوسکا اس کے

© NCERT not to be republished

زخم کو اچھّی طرح دھویا۔ اس پر اپنے رومال اور سادھو کے تولیے سے پٹّی باندھی لیکن خون کا بہنا بند نہیں ہوا۔ بادشاہ بار بار پٹّی کھولتا رہا جو گرم خون سے تر ہو جاتی اور اسے دھو دھو کر بار بار باندھتا رہا۔ آخر کار جب خون کا بہنا بند ہو گیا تو آدمی کو ہوش آیا اور اس نے کچھ پینے کے لیے مانگا۔ اتنی دیر میں بادشاہ تازہ پانی لایا اور اسے پلایا۔ سورج ڈوب چکا تھا اور ٹھنڈک بھی بڑھ چلی تھی۔ اسی لیے بادشاہ نے سادھو کی مدد سے زخمی کو جھونپڑے کے اندر پہنچایا اور اس کو چار پائی پر لٹا دیا۔ چار پائی پر لیٹتے ہی اس آدمی نے آنکھیں بند کر لیں اور خاموش ہو گیا۔ بادشاہ بھی دن بھر کی دوڑ دھوپ اور کام کی وجہ سے اتنا تھک گیا تھا کہ وہ دہلیز پر ہی پڑ کر سو رہا۔ رات بھر اس کی آنکھ بھی نہ کُھلی۔ صبح جب اسے ہوش آیا تو اس کو بڑی دیر تک یاد ہی نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ داڑھی والا آدمی جو چار پائی پر لیٹا ہوا اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے اُسے ٹکٹکی لگائے ہوئے دیکھ رہا ہے، کون ہے؟

''مجھے معاف کر دیجیے۔'' اس داڑھی والے آدمی نے بادشاہ کو جاگتے اور اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو کہا۔

''میں تم کو نہیں جانتا اور ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کے لیے میں تم کو معاف کروں۔'' بادشاہ نے کہا۔

''آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کو جانتا ہوں۔ میں آپ کا وہ دشمن ہوں جس نے آپ سے بدلہ لینے کی قسم کھائی تھی۔

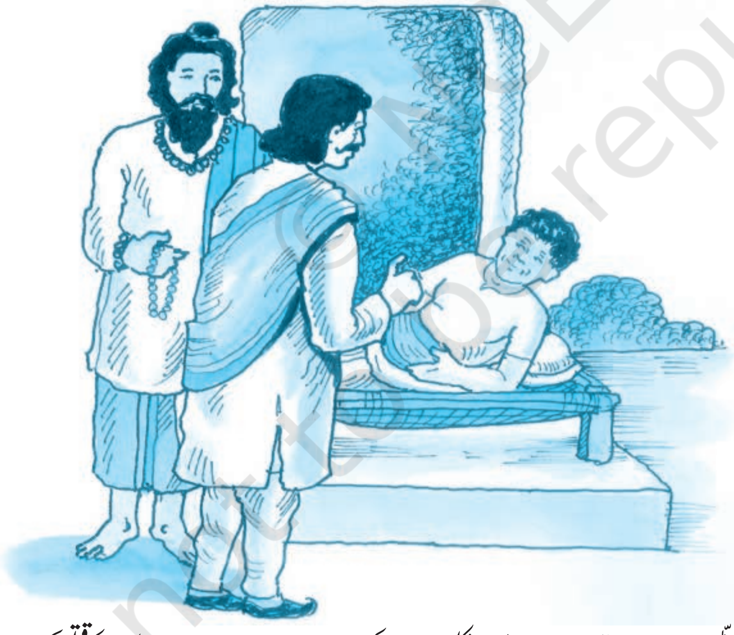

آپ نے میرے بھائی کو قتل کر دیا تھا اور اس کی جائداد ضبط کر لی تھی۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ سادھو سے ملنے اکیلے گئے ہیں۔ میں نے طے کیا کہ جب آپ لوٹیں گے، میں آپ کو راستے میں قتل کر دوں گا لیکن دن گزر گیا اور آپ نہیں لوٹے۔ اس لیے میں آپ کا پتا لگانے کے لیے اپنی کمیں گاہ سے نکل آیا۔ آپ کے حفاظتی دستے کے سپاہیوں سے میری مُڈ بھیڑ ہو گئی۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا اور زخمی کر دیا۔ میں ان سے تو بھاگ آیا لیکن اگر آپ میرے زخم پر پٹّی نہ باندھتے تو میں زیادہ خون نکل جانے کی وجہ سے مر جاتا۔ میں نے آپ کو قتل کرنا چاہا لیکن آپ نے میری جان بچالی۔ اب اگر میں زندہ رہا اور آپ کی بھی مرضی ہوئی تو میں ساری زندگی آپ کی خدمت ایک وفادار

غلام کی حیثیت سے کرتا رہوں گا۔ میں اپنے لڑکوں کو بھی نصیحت کر جاؤں گا کہ وہ ایسا ہی کریں۔ مجھے معاف کر دیجیے۔''

بادشاہ اپنے دشمن سے، اتنی آسانی سے صلح کر کے اور اُسے دوست بنا کر بہت خوش ہوا۔ اُس نے اس کو معاف ہی نہیں کیا بلکہ اس سے کہا کہ وہ اپنے نوکروں اور شاہی طبیب کو اس کی دیکھ بھال اور علاج کے لیے بھیجے گا۔ اور اس کی جائداد بھی اسے واپس کر دے گا۔

زخمی آدمی سے رُخصت ہو کر بادشاہ دہلیز کے سامنے گیا اور سادھو کو اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جانے سے پہلے وہ ایک بار پھر اپنے سوالوں کے جواب حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سادھو باہر اپنے گھٹنوں پر جُھکا ہوا اُن کیاریوں میں بُوائی کر رہا تھا جو ایک روز پہلے گوڑی اور بنائی گئی تھیں۔

بادشاہ سادھو کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔

''عقل مند آدمی! میں آخری بار تم سے اپنے سوالوں کے جواب کی درخواست کرتا ہوں۔''

''جواب تو تم پا چکے ہو۔'' سادھو نے کہا جو ابھی تک اپنی دبلی پتلی ٹانگوں پر جھکا ہوا بادشاہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کیسا جواب؟ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''کیا تمھاری سمجھ میں نہیں آیا۔'' سادھو نے جواب دیا۔ ''اگر تم نے کل میری کمزوری پر ترس کھا کر ان کیاریوں کو میرے لیے گوڑا نہ ہوتا اور اپنے راستے پر چلے گئے ہوتے تو وہ آدمی تم پر حملہ کر دیتا اور تم میرے ساتھ نہ ٹھہرے رہنے پر افسوس کر رہے ہوتے۔ اس لیے وہ وقت بہت اہم تھا جب تم کیاریاں گوڑ رہے تھے۔ میں بہت اہم آدمی تھا اور میرے ساتھ نیکی کرنا سب سے اہم کام تھا۔ بعد کو جب وہ آدمی بھاگ کر ہم لوگوں کے پاس آیا تو وہ وقت بڑا اہم تھا جب تم اس کی دیکھ بھال کر رہے تھے کیوں کہ اگر تم اس کے زخموں پر پٹّی نہ باندھتے تو وہ تم سے صلح کیے بغیر مر جاتا۔ اس لیے وہ بہت اہم آدمی تھا اور جو کچھ تم نے اس کے لیے کیا وہ بہت اہم کام تھا۔ اس لیے یاد رکھو کہ ایک ہی وقت بہت اہم ہے اور وہ ہے ''اب''۔ یہ بہت اہم وقت ہے۔ اس لیے کہ یہی وہ وقت ہے جب ہمیں کوئی طاقت حاصل رہتی ہے۔ سب سے اہم آدمی وہ ہے جس کے ساتھ تم ہو۔ کیونکہ کسی کو نہیں معلوم کہ اس کا معاملہ پھر کسی دوسرے سے پڑے گا بھی یا نہیں اور سب سے اہم کام یہ ہے کہ اس کے ساتھ نیکی کی جائے، اس لیے کہ انسان کو اسی مقصد سے یہ زندگی عطا ہوئی ہے۔''

(لیو ٹالسٹائی)

مشق

سوالات

1۔ بادشاہ کے تین سوال کیا تھے؟

2۔ بادشاہ سادھو کے پاس کیوں اور کس طرح گیا؟

3۔ بادشاہ کا دشمن بادشاہ کی کس بات سے متاثر ہوا؟

4۔ سادھو نے بادشاہ کے سوالوں کا جواب کس طرح دیا؟

5۔ اس کہانی سے کیا پیغام ملتا ہے؟

© NCERT not to be republished

پریم چند

(1936-1880)

پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ وہ بنارس کے قریب ایک گاؤں لمہی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا شمار اردو کے ابتدائی اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے حقیقی مسائل پیش کیے گئے ہیں۔ عام انسان، خصوصاً دیہاتی کسان اور مزدور، ان کے افسانوں کے اہم کردار ہوتے ہیں۔

پریم چند نے سیکڑوں افسانے اور کئی ناول لکھے ہیں۔ 'پریم پچیسی'، 'پریم بتّیسی'، 'دودھ کی قیمت' اور 'واردات' ان کے اہم افسانوی مجموعے ہیں۔ 'گئودان'، 'غبن'، 'میدانِ عمل'، 'بیوہ' اور 'بازارِ حسن' ان کے اہم ناول ہیں۔

© NCERT not to be republished

5287CH03

بوڑھی کاکی

بڑھاپا اکثر بچپن کا دورِ ثانی ہوا کرتا ہے۔ بوڑھی کاکی میں ذائقہ کے سوا کوئی حِس باقی نہ تھی اور نہ اپنی شکایتوں کی طرف مخاطب کرنے کا رونے کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ۔ آنکھیں، ہاتھ، پیر سب جواب دے چکے تھے۔ زمین پر پڑی رہتیں اور جب گھر والے کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف کرتے، کھانے کا وقت ٹل جاتا یا مقدار کافی نہ ہوتی یا بازار سے کوئی چیز آتی اور انھیں نہ ملتی تو وہ رونے لگتی تھیں اور ان کا رونا محض بسورنا نہ تھا۔ وہ بہ آواز بلند روتی تھیں۔ ان کے شوہر کو مرے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا۔ سات بیٹے جوان ہو ہو کر داغ دے گئے اور اب ایک بھتیجے کے سوا دنیا میں ان کا اور کوئی نہ تھا۔ اسی بھتیجے کے نام انھوں نے اپنی ساری جائداد لکھ دی تھی۔ اُن حضرت نے لکھاتے وقت تو خوب لمبے چوڑے وعدے کیے لیکن وہ وعدے صرف سبز باغ تھے۔ اگرچہ اس جائداد کی سالانہ آمدنی ڈیڑھ دوسو روپے سے کم نہ تھی۔ لیکن بوڑھی کاکی کو اب پیٹ بھر روکھا دانہ بھی مشکل سے ملتا تھا۔

بدھ رام طبیعت کے نیک آدمی تھے۔ لیکن اسی وقت تک کہ ان کی جیب پر کوئی آنچ نہ آئے۔ روپا طبیعت کی تیز تھی لیکن ایشور سے ڈرتی تھی، اس لیے بوڑھی کاکی پر اس کی تیزی اتنی نہ کھلتی تھی جتنی بدھ رام کی نیکی۔

بدھ رام کو کبھی کبھی اپنی بے انصافی کا احساس ہوتا۔ وہ سوچتے کہ اس جائداد کی بدولت میں اس وقت بھلا آدمی بنا بیٹھا ہوں اور اگر زبانی تسکین یا تشفّی سے صورتِ حال میں کچھ اصلاح ہوسکتی تو انھیں مطلق دریغ نہ ہوتا لیکن مزید خرچ کا خوف ان کی نیکی کو دبائے رکھتا تھا۔ اِس کے برعکس اگر دروازہ پر کوئی بھلا مانس بیٹھا ہوتا اور بوڑھی کاکی اپنا نغمۂ بے ہنگام شروع کر دیتیں تو وہ آگ ہو جاتے تھے اور گھر میں آکر انھیں زور سے ڈانٹتے تھے۔ لڑکے جنھیں بڈھوں سے ایک بغضِ للّٰہی ہوتا ہے، والدین کا یہ رنگ دیکھ کر بوڑھی کاکی کو اور بھی دِق کرتے۔ کوئی چٹکی لے کر بھاگتا، کوئی ان پر پانی کی کُلّی کر دیتا۔ کاکی چیخ مار کر روتیں لیکن یہ تو مشہور ہی تھا کہ وہ صرف کھانے کے لیے روتی ہیں۔ اس لیے کوئی ان کے نالہ وفریاد پر دھیان نہ دیتا تھا۔ ہاں اگر کاکی کبھی غصّے میں آکر لڑکوں کو گالیاں دینے لگتیں تو روپا موقعۂ واردات پر ضرور جاتی۔ اس خوف سے کاکی اپنی شمشیر زبانی کا شاذ ہی کبھی استعمال کرتی تھیں۔ حالاں کہ رفعِ شر کی یہ تدبیر رونے سے زیادہ کارگر تھی۔

سارے گھر میں اگر کسی کو کاکی سے محبت تھی تو وہ بدھ رام کی چھوٹی لڑکی لاڈلی تھی۔ لاڈلی اپنے دونوں بھائیوں کے خوف

سے اپنے حصّے کی مٹھائی یا چبینا بوڑھی کاکی کے پاس بیٹھ کر کھایا کرتی تھی۔ ان مناسب اغراض نے ان دونوں میں محبت اور ہمدردی پیدا کر دی تھی۔

رات کا وقت تھا۔ بدھ رام کے دروازے پر شہنائی بج رہی تھی اور گاؤں کے بچّوں کا جمّ غفیر نگاہِ حیرت سے گانے کی داد دے رہا تھا۔ آج بدھ رام کے بڑے لڑکے سکھ رام کا تلک آیا ہے۔ یہ اسی کا جشن ہے۔ گھر میں مستورات گا رہی تھیں اور روپا مہمانوں کی دعوت کا سامان کرنے میں مصروف تھی۔ بھٹیوں پر کڑاہ چڑھے ہوئے تھے۔ ایک میں پوریاں کچوریاں نکل رہی تھیں۔ ایک بڑے ہنڈے میں مصالحے دار ترکاری پک رہی تھی۔ گھی اور مصالحے کی اشتہا انگیز خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

بوڑھی کاکی اپنی اندھیری کوٹھری میں خیالِ غم کی طرح بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ لذّت آمیز خوشبو انھیں بے تاب کر رہی تھی۔ وہ دل میں سوچتی تھیں شاید مجھے پوریاں نہ ملیں گی۔ اتنی دیر ہوگئی، کوئی کھانا لے کر نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے لوگ سب کھا گئے ہیں۔ میرے لیے کچھ نہ بچا۔ یہ سوچ کر انھیں بے اختیار رونا آیا۔ لیکن شگون کے خوف سے رو نہ سکیں۔

آہا! کیسی خوش بو ہے۔ اب مجھے کون پوچھتا ہے۔ جب روٹیوں ہی کے لالے ہیں تو ایسے نصیب کہاں کہ پوریاں پیٹ بھر ملیں۔ یہ سوچ کر انھیں پھر بے اختیار رونا آیا۔ کلیجے میں ایک ہُوک سی اُٹھنے لگی لیکن روپا کے خوف سے انھوں نے پھر ضبط کیا۔

بوڑھی کاکی دیر تک اِنھیں افسوس ناک خیالوں میں ڈوبی رہیں۔ گھی اور مصالحے کی خوش بو رہ رہ کر دل کو آپے سے باہر کیے دیتی تھی۔ منہ میں پانی بھر بھر آتا تھا۔ پوریوں کا ذائقہ یاد کر کے دل میں گُد گُدی ہونے لگتی تھی۔ ”کسے پکاروں۔ آج لاڈلی بھی نہیں آئی۔ دونوں لونڈے روز دِق کیا کرتے ہیں۔ آج ان کا بھی کہیں پتا نہیں۔ کچھ معلوم ہوتا کہ کیا بَن رہا ہے۔“

بوڑھی کاکی کی چشمِ خیال میں پوریوں کی تصویر ناچنے لگی۔ خوب لال لال پھولی پھولی نرم نرم ہوں گی۔ روپا نے خوب مائن دیا ہوگا۔ کچوریوں میں اجوائن اور الائچی کی مہک آ رہی ہوگی۔ ایک پوری ملتی تو ذرا ہاتھ میں لے کر دیکھتی۔ کیوں نہ چل کر کڑاہ کے سامنے ہی بیٹھوں۔ پوریاں چھن چھن کر کے کڑاہ میں تیرتی ہوں گی۔ کڑاہ سے گرما گرم نکل کر کٹھونے میں رکھی جاتی ہوں گی۔ پھول ہم گھر میں بھی سونگھ سکتے ہیں لیکن سیرِ باغ کا کچھ اور ہی لطف ہے۔

اس طرح فیصلہ کر کے بوڑھی کاکی اُکڑوں بیٹھ کر ہاتھ کے بل کھسکتی ہوئی بمشکل تمام چوکھٹ سے اتریں اور دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی کڑھاؤ کے پاس جا بیٹھیں۔ روپا اس وقت ایک سراسیمگی کی حالت میں تھی۔ کبھی اس کمرے میں جاتی، کبھی اس کمرے میں، کبھی کڑاہ کے پاس، کبھی کوٹھے پر۔ کسی نے باہر سے آ کر کہا، ”مہراج ٹھنڈائی مانگ رہے ہیں۔“ ٹھنڈائی دینے لگی۔ ایک آدمی نے آ کر پوچھا کہ ابھی کھانا تیار ہونے میں کتنی دیر ہے؟ ذرا ڈھول مجیرا اتار دو۔ بے چاری اکیلی عورت چاروں طرف

دوڑتے دوڑتے حیران ہورہی تھی۔ جھنجھلاتی تھی۔ کُڑھتی تھی پر غصّہ باہر نکلنے کا موقع نہ پاتا تھا۔ خوف ہوتا تھا۔ کہیں پڑوسنیں یہ نہ کہنے لگیں کہ اتنے ہی میں اُبل پڑیں۔ پیاس سے خود اس کا حلق سوکھا جاتا تھا۔ گرمی کے مارے پھنکی جاتی تھی لیکن اتنی فرصت کہاں کہ ذرا پانی پی لے یا پنکھا لے کر جھلے۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ ذرا نگاہ پلٹی اور چیزوں کی لوٹ مچی۔ اس کش مکش کے عالم میں اس نے بوڑھی کاکی کو کڑاہ کے پاس بیٹھے دیکھا تو جل گئی۔ غصّہ نہ رک سکا، یہ خیال نہ رہا کہ پڑوسنیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ دل میں کیا کہیں گی۔ مردانے میں لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ جیسے مینڈک کیچوے پر جھپٹتا ہے اسی طرح وہ بوڑھی کاکی پر جھپٹی اور انھیں دونوں ہاتھوں سے جھنجوڑ کر بولی، '' ایسے پیٹ میں آگ لگے۔ پیٹ ہے کہ آگ کا کُنڈ ہے۔ کوٹھری میں بیٹھتے کیا دم گھٹتا تھا۔ ابھی مہمانوں نے نہیں کھایا۔ دیوتاؤں کا بھوگ تک نہیں لگا۔ تب تک صبر نہ ہو سکا۔ آکر چھاتی پر سوار ہوگئیں۔ نوج، ایسی جیبھ۔ دن بھر کھاتی نہ رہتیں تو نہ جانے کس کی ہانڈی میں منہ ڈالتیں۔ گاؤں دیکھے گا تو کہے گا کہ بڑھیا بھر پیٹ کھانے کو نہیں پاتی۔ تب ہی تو اس طرح بوکھلائی پھرتی ہے۔ (اس خیال سے اس کا غصّہ اور بھی تیز ہوگیا) ڈائن نہ مرے نہ ماچا چھوڑے۔ نام بیچنے پر لگی ہے۔ ناک کٹوا کے دم لے گی۔ اتنا ٹھونستی ہے نہ جانے کہاں بھسم ہوجاتا ہے۔ لے بھلا چاہتی ہو تو جا کر کوٹھری میں بیٹھو۔ جب گھر کے لوگ لیں گے تو تمھیں بھی ملے گا۔ تم کوئی دیوی نہیں ہو کہ چاہے کسی کے منہ میں پانی تک نہ جائے لیکن پہلے تمھاری پوجا کردے۔

بوڑھی کاکی نے سر نہ اٹھایا۔ نہ روئیں نہ بولیں۔ چپ چاپ رینگتی ہوئی وہاں سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ صدمہ ایسا سخت تھا کہ دل ودماغ کی ساری قوّتیں، سارے جذبات ساری حسّیات اس طرح رجوع ہوگئیں تھیں جیسے ندی میں جب کراڑ کا کوئی بڑا ٹکڑا کٹ کر گرتا ہے تو آس پاس کا پانی چاروں طرف سے سمٹ کر اس خلا کو پورا کرنے کے لیے دوڑتا ہے۔

کھانا تیار ہوگیا۔ آنگن میں پتّل پڑ گئے۔ مہمان کھانے لگے۔ عورتوں نے جیونار گانا شروع کیا۔ لیکن آدابِ مجلس کے مطابق جب تک سب کے سب کھانہ چکیں کوئی اُٹھ نہ سکتا تھا۔

بوڑھی کاکی اپنی کوٹھری میں جا کر پچھتا رہی تھیں کہ کہاں سے کہاں گئی۔ انھیں روپا پر غصّہ نہیں تھا۔ اپنی عجلت پر افسوس تھا۔ سچ تو ہے جب تک مہمان لوگ کھانہ چکیں گے گھر والے کیسے کھائیں گے۔ مجھ سے اتنی دیر بھی نہ رہا گیا۔ سب کے سامنے پانی اتر گیا۔ اب جب تک کوئی نہ بلانے آئے گا نہ جاؤں گی۔

دل میں یہ فیصلہ کرکے وہ خموشی سے بلاوے کا انتظار کرنے لگیں لیکن گھی کی مرغوب خوشبو بہت صبر آزما ثابت ہورہی تھی۔ انھیں ایک ایک لمحہ ایک گھنٹہ معلوم ہوتا تھا۔ اب پتّل بچھ گئے ہوں گے۔ اب مہمان آگئے ہوں گے۔ لوگ ہاتھ پیر دھورہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے لوگ کھانے پر بیٹھ گئے۔ جیونار گایا جارہا ہے۔ یہ سوچ کر بہانے کے لیے لیٹ گئیں اور دھیرے دھیرے گنگنانے

لگیں۔ انھیں معلوم ہوا کہ مجھے گاتے بہت دیر ہوگئی۔ کیا اتنی دیر تک لوگ کھا ہی رہے ہوں گے۔ کسی کی بول چال سنائی نہیں دیتی۔ ضرور لوگ کھا پی کے چلے گئے۔ مجھے کوئی بلانے نہیں آیا۔ روپا چڑ گئی ہے۔ کیا جانے نہ بلائے۔ سوچتی ہو کہ آپ ہی آئیں گی۔ کوئی مہمان نہیں کہ بلاؤں۔

بوڑھی کاکی چلنے کے لیے تیار ہوئیں۔ یہ یقین کہ اب ایک لمحے میں پوریاں اور مصالحے دار ترکاریاں سامنے آئیں گی ان کے حسنِ ذائقہ کو گدگدانے لگا۔ انھوں نے دل میں طرح طرح کے منصوبے باندھے۔ 'پہلے ترکاری سے پوریاں کھاؤں گی پھر دہی اور شکر سے۔ کچوریاں رائتے کے ساتھ مزے دار معلوم ہوں گی۔ چاہے کوئی برا مانے یا بھلا میں تو مانگ مانگ کر کھاؤں گی۔ یہی نہ، لوگ کہیں گے، انھیں لحاظ نہیں ہے۔ کیا کریں۔ اتنے دنوں کے بعد پوریاں مل رہی ہیں تو منہ جھوٹا کر کے تھوڑے ہی اٹھ آؤں گی۔

وہ اکڑوں بیٹھ کر ہاتھوں کے بل کھسکتی ہوئی آنگن میں آئیں۔ مگر وائے قسمت! اشتیاق نے اپنی پرانی عادت کے مطابق وقت کا غلط اندازہ کیا تھا۔ مہمانوں کی جماعت ابھی بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی کھا کر انگلیاں چاٹتا تھا اور کنکھیوں سے دیکھتا تھا کہ اور لوگ کھا رہے ہیں یا نہیں۔ کوئی اس فکر میں تھا کہ پتّل پر پوریاں چھوٹی جاتی ہیں۔ کاش کسی طرح انھیں اندر رکھ لیتا۔ کوئی دہی کھا کے زبان چٹخارتا تھا لیکن دوسرا سکورا مانگتے ہوئے شرماتا تھا کہ اتنے میں بوڑھی کاکی رینگتی ہوئی ان کے بیچ میں جا پہنچیں۔ کئی آدمی چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ آوازیں آئیں۔ ''ارے یہ کون بڑھیا ہے؟ دیکھ کسی کو چھومت، اے۔''

پنڈت بدھ رام کاکی کو دیکھتے ہی غصّے سے تِلملا گئے۔ پوریوں کا تھال لیے کھڑے تھے۔ تھال کو زمین پر پٹک دیا اور جس طرح بے رحم ساہوکار اپنے کسی نادہند مغرور اسامی کو دیکھتے ہی جھپٹ کر اس کا ٹیٹوا لیتا ہے اسی طرح لپک کر انھوں نے بوڑھی کاکی کے دونوں شانے پکڑے اور گھسیٹتے ہوئے لا کر انھیں اس اندھیری کوٹھری میں دھم سے گرا دیا۔ آرزوؤں کا سبز باغ لؤ کے ایک جھونکے میں ویران ہوگیا۔

مہمانوں نے کھانا کھایا، گھر والوں نے کھایا، باجے والے بھی کھا چکے لیکن بوڑھی کاکی کو کسی نے نہ پوچھا۔ بدھ رام اور روپا دونوں ہی انھیں ان کی بے حیائی کی سزا دینے کا تصفیہ کر چکے تھے۔ ان کے بڑھاپے پر، بے کسی پر، فتورِ عقل پر کسی کو ترس نہیں آتا تھا۔ اکیلی لاڈلی ان کے لیے کُڑھ رہی تھی۔

لاڈلی کو کاکی سے بہت اُنس تھا۔ بے چاری بھولی، سیدھی لڑکی تھی۔ طفلانہ شوخی اور شرارت کی اس میں بو تک نہ تھی۔ دونوں بار جب اس کے ماں اور باپ نے کاکی کو بے رحمی سے گھسیٹا تو لاڈلی کا کلیجہ بیٹھ کر رہ گیا۔ وہ جھنجھلا رہی تھی کہ یہ لوگ کاکی کو کیوں بہت سی پوریاں نہیں دے دیتے۔ کیا مہمان سب کی سب تھوڑے ہی کھا جائیں گے اور اگر کاکی نے مہمانوں سے پہلے ہی کھا لیا تو کیا

بگڑ جائے گا؟ وہ کاکی کے پاس جا کر انھیں تشفّی دینا چاہتی تھی لیکن ماں کے خوف سے نہ جاتی تھی۔ اس نے اپنے حصّے کی پوریاں مطلق نہ کھائی تھیں۔ اپنی گڑیوں کی پٹاری میں بند کر رکھی تھیں۔ وہ یہ پوریاں کاکی کے پاس لے جانا چاہتی تھی۔ اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ بوڑھی کاکی میری آواز سنتے ہی اٹھ بیٹھیں گی۔ پوریاں دیکھ کر کیسی خوش ہوں گی۔ مجھے خوب پیار کریں گی۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ روپا آنگن میں پڑی سو رہی تھی۔ لاڈلی کی آنکھوں میں نیند نہ آتی تھی۔ کاکی کو پوریاں کھلانے کی خوشی اسے سونے نہ دیتی تھی۔ اس نے گڑیوں کی پٹاری سامنے ہی رکھی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اماّں غافل سو رہی ہیں تو وہ چپکے سے اٹھی اور سوچنے لگی کہ کیسے چلوں۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ صرف چولھوں میں آگ چمک رہی تھی۔ اور چولھوں کے پاس ایک کُتا لیٹا ہوا تھا۔ لاڈلی کی نگاہ دروازے والے نیم کے درخت کی طرف گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ اس پر ہنومان جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی دُم، ان کی گدا سب صاف نظر آتی تھی۔ مارے خوف کے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اتنے میں کُتا اٹھ بیٹھا۔ لاڈلی کو ڈھارس ہوئی۔ کئی سوتے ہوئے آدمیوں کی بہ نسبت ایک جاگتا ہوا کتا اس کے لیے زیادہ تقویت کا باعث ہوا۔ اس نے پٹاری اٹھائی اور بوڑھی کاکی کی کوٹھری کی طرف چلی۔

بوڑھی کاکی کو محض اتنا یاد تھا کہ کسی نے میرے شانے پکڑے، پھر انھیں ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی پہاڑ اڑائے لیے جاتا ہے۔ ان کے پیر بار بار پتھروں سے ٹکرائے۔ تب کسی نے انھیں پہاڑ پر سے پٹک دیا۔ وہ بے ہوش ہو گئیں۔

جب ان کے ہوش بجا ہوئے تو کسی کی ذرا بھی آہٹ نہ ملتی تھی۔ سمجھ گئیں کہ سب لوگ کھا پی کر سو گئے اور ان کے ساتھ میری تقدیر بھی سو گئی۔ رات کیسے کٹے گی۔ رام! کیا کھاؤں؟ پیٹ میں آگ جل رہی ہے۔ ہا! کسی نے میری سُدھ نہ لی۔ کیا میرا ہی پیٹ کاٹنے سے دھن ہو جائے گا؟ ان لوگوں کو اتنی دَیا بھی نہیں آتی کہ بڑھیا نہ جانے کب مر جائے۔ اس کا رویاں کیوں دُکھائیں۔ میں پیٹ کی روٹیاں ہی کھاتی ہوں کہ اور کچھ۔ اس پر یہ حال۔ میں اندھی اپاہج ٹھہری۔ نہ کچھ سوجھے نہ بوجھے۔ اگر آنگن میں چلی گئی تو کیا بدھ رام سے اتنا کہتے نہ بنتا تھا کہ کاکی ابھی لوگ کھا رہے ہیں۔ پھر آنا۔ مجھے گھسیٹا، پٹکا۔ انھیں پوریوں کے لیے روپا نے سب کے سامنے گالیاں دیں۔ انھیں پوریوں کے لیے اور اتنی درگت کر کے بھی ان کا پتّھر کا کلیجہ نہ پسیجا۔ سب کو کھلایا۔ میری بات نہ پوچھی۔ جب تب ہی نہ دیا تو اب کیا دے گی۔ یہ سوچ کر مایوسانہ صبر کے ساتھ لیٹ گئیں۔ رِقّت سے گلا بھر بھر آتا تھا۔ لیکن مہمانوں کے لحاظ سے روتی نہ تھیں۔

یکا یک ان کے کان میں آواز آئی۔ ''کاکی اٹھو میں پوریاں لائی ہوں۔''

کاکی نے لاڈلی کی آواز پہچانی۔ چٹ پٹ اٹھ بیٹھیں۔ دونوں ہاتھ سے لاڈلی کو ٹٹولا اور اسے گود میں بٹھالیا۔ لاڈلی نے

پوریاں نکال کر دیں۔ کاکی نے پوچھا۔
''کیا تمھاری امّاں نے دی ہیں؟''

لاڈلی نے فخر سے کہا ''نہیں یہ میرے حصّے کی ہیں۔''
کاکی پوریوں پر ٹوٹ پڑیں۔ پانچ منٹ میں پٹاری خالی ہوگئی۔ لاڈلی نے پوچھا، ''کاکی پیٹ بھر گیا؟''
جیسے تھوڑی سی بارش ٹھنڈک کی جگہ اور بھی اُمس پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح ان چند پوریوں نے کاکی کی اشتہا اور رغبت کو اور بھی تیز کر دیا تھا۔ بولیں، ''نہیں بیٹی جاکے امّاں سے اور مانگ لاؤ۔''
لاڈلی: ''اماں سوتی ہیں۔ جگاؤں گی تو امّاں ماریں گی۔''
کاکی نے پٹاری کو پھر ٹٹولا۔ اس میں چند ریزے گرے تھے۔ انھیں نکال کر کھا گئیں۔ بار بار ہونٹ چاٹتی تھیں۔ چٹخارے بھرتی تھیں۔ دل مسوس رہا تھا کہ اور پوریاں کیسے پاؤں؟ صبر کا باندھ جب ٹوٹ جاتا ہے تو خواہش کا بہاؤ قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ مستوں کو سرور کی یاد دلانا انھیں دیوانہ بناتا ہے۔ کاکی کا بیتاب دل خواہش کے اس بہاؤ میں بہہ گیا۔ حلال حرام کی تمیز نہ رہی۔ وہ کچھ دیر تک اس خواہش کو روکتی رہیں۔ یکا یک لاڈلی سے بولیں۔
''میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے چلو جہاں مہمانوں نے بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔''
لاڈلی ان کا منشا نہ سمجھ سکی۔ اس نے کاکی کا ہاتھ پکڑا اور انھیں لاکر جھوٹے پتّلوں کے پاس بٹھا دیا اور غریب بھوک کی ماری

فاترالعقل بڑھیا پتّلوں سے پوریوں کے ٹکڑے چن چن کر کھانے لگی۔ دہی کتنا لذیذ تھا۔ سالن کتنا مزے دار، کچوریاں کتنی سلونی۔ سموسے کتنے خستہ اور نرم۔؟

کا کی فتورِ عقل کے باوجود جانتی تھیں کہ میں وہ کر رہی ہوں جو مجھے نہ کرنا چاہیے۔ میں دوسروں کے جھوٹے پتّل چاٹ رہی ہوں۔ لیکن بڑھاپے کی حرص، مرض کا آخری دور ہے۔ جب سارے حواس ایک ہی مرکز پر آ کر جمع ہو جاتے ہیں۔ بوڑھی کا کی میں یہ مرکز ان کا حسنِ ذائقہ تھا۔

عین اسی وقت روپا کی آنکھ کھلی۔ اسے معلوم ہوا کہ لاڈلی میرے پاس نہیں ہے، چونکی چارپائی کے ادھر اُدھر تاکنے لگی کہ کہیں لڑکی نیچے تو نہیں گر پڑی۔ اسے وہاں نہ پا کر وہ اٹھ بیٹھی تو کیا دیکھتی ہے کہ لاڈلی جھوٹے پتّلوں کے پاس چپ چاپ کھڑی ہے اور بوڑھی کا کی پتّلوں پر سے پوریوں کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر کھا رہی ہیں۔ روپا کا کلیجہ سن سے ہو گیا۔ ایک برہمنی دوسروں کا جھوٹا پتّل ٹٹولے اس سے عبرتناک نظارہ ناممکن تھا۔ پوریوں کے چند لقموں کے لیے اس کی چچیری ساس ایسا رکیک اور حقیر فعل کر رہی ہے۔ یہ وہ نظارہ تھا جس سے دیکھنے والوں کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ زمین رک گئی ہے۔ آسمان چکّر کھا رہا ہے۔ دنیا پر کوئی نئی آفت آنے والی ہے۔ روپا کو غصّہ نہ آیا۔ عبرت کے سامنے غصّے کا ذکر کیا؟ درد اور خوف سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس دھرم اور پاپ کا الزام کس پر ہے؟ اس نے صدقِ دل سے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا، ''پرماتما! میرے بچّوں پر رحم کرنا۔ اس ادھرم کی سزا مجھے مت دینا۔ ہمارا ستیاناس ہو جائے گا۔''

روپا کو اپنی خود غرضی اور بے انصافی آج تک کبھی اتنی صفائی سے نظر نہ آئی تھی۔ ہائے میں کتنی بے رحم ہوں۔ جس کی جائداد سے مجھے دو سو روپے سال کی آمدنی ہو رہی ہے۔ اس کی یہ درگت اور میرے کارن۔ اے ایشور مجھ سے بڑا بھاری گناہ ہوا ہے، مجھے معاف کرو۔ آج میرے بیٹے کا تلک تھا۔ سیکڑوں آدمیوں نے کھانا کھایا۔ میں ان کے اشارے کی غلام بنی ہوئی تھی۔ اپنے نام کے لیے، اپنی بڑائی کے لیے سیکڑوں روپے خرچ کر دیے لیکن جس کی بدولت ہزاروں روپے کھائے اسے اس تقریب کے دن بھی پیٹ بھر کر کھانا نہ دے سکی۔ محض اس لیے نہ کہ وہ بڑھیا ہے، بے کس ہے، بے زبان ہے۔

اس نے چراغ جلایا۔ اپنے بھنڈارے کا دروازہ کھولا اور ایک تھالی میں کھانے کی سب چیزیں سجا کر لیے ہوئے بوڑھی کا کی کی طرف چلی۔

آدھی رات ہو چکی تھی، آسمان پر تاروں کے تھال سجے ہوئے تھے اور ان پر بیٹھے ہوئے فرشتے بہشتی نعمتیں سجا رہے تھے۔ لیکن ان میں کسی کو وہ مسرّت نہ حاصل ہو سکتی تھی جو بوڑھی کا کی کو اپنے سامنے تھال دیکھ کر ہوئی۔ روپا نے رقّت آمیز لہجہ میں کہا۔

© NCERT not to be republished

''کاکی اٹھو کھانا کھالو۔ مجھ سے آج بڑی بھول ہوئی۔ اس کا برا نہ ماننا۔ پرماتما سے دعا کرو کہ وہ میری خطا معاف کردے۔''

بھولے بھالے بچّے کی طرح جو مٹھائیاں پا کر مار اور گُھڑکیاں سب بھول جاتا ہے، بوڑھی کاکی بیٹھی ہوئی کھانا کھا رہی تھیں۔ ان کے ایک ایک روئیں سے سچی دعائیں نکل رہی تھیں اور روپا بیٹھی یہ روحانی نظارہ دیکھ رہی تھی۔

(منشی پریم چند)

مشق

سوالات

1۔ کاکی کے عزیزوں میں کون کون باقی بچا تھا؟

2۔ روپا نے کاکی کو کڑاہ کے پاس بیٹھے دیکھ کر غصّے میں کیا کہا؟

3۔ لاڈلی کو نیند کیوں نہیں آرہی تھی؟

4۔ کاکی کو جھوٹے پتّل چاٹتے دیکھ کر روپا کا ردِّ عمل کیا تھا؟

5۔ روپا کے معافی مانگنے پر کاکی نے کیا کیا؟

© NCERT not to be republished

ناول

ناول اُس نثری صِنف کو کہا جاتا ہے جس میں ایک مربوط قصہ بیان کیا گیا ہو اور جو ایک وسیع پس منظر میں زندگی کی ترجمانی کرتا ہو۔ ناول کا فن دراصل معاشرتی یا انفرادی زندگی کی ترجمانی اور تصویر کشی کا فن ہے۔ ناول نویس اپنے فکر و خیال سے ایک نئی حقیقت وضع کرتا ہے جو دراصل زندگی سے ماخوذ ہوتی ہے۔ روایتی ناول کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ یعنی کہانی، کردار، مکالمہ اور نظریۂ حیات پر بالخصوص زور دیا جاتا ہے۔ ان اجزا میں منظر نگاری بھی شامل ہے لیکن ناول کے فن میں بہت تنوّع ہے۔

اُنیسویں صدی عیسوی کے نصفِ آخر میں ہندوستان غیر ملکی سامراج کے شکنجے میں تھا لیکن مغربی تعلیم کے اثر سے نشاۃُ الثّانِیہ کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ اس زمانے میں نذیر احمد اور ان کے معاصرین کے ہاتھوں اردو ناول کا آغاز ہوا۔ اردو کے ابتدائی ناول قصّوں کی شکل میں وجود میں آئے جن کا بنیادی مقصد اخلاقی اور معاشرتی اصلاح تھا۔ نذیر احمد کے ناولوں میں ''مِراۃ العروس''، ''توبتہ النّصوح''، ''ابن الوقت'' اور ''فسانۂ مبتلا'' خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ رتن ناتھ سرشار نے کئی ناول لکھے لیکن ''فسانۂ آزاد'' کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ سرشار کے ہم عصروں میں سجاد حسین، قاری سرفراز حسین اور عبدالحلیم شرر خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ شرر کے تاریخی ناول بہت مقبول ہوئے۔ مرزا محمد ہادی رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' کا شمار اردو کے بہترین ناولوں میں ہوتا ہے۔ رسوا کے بعد پریم چند اردو کے سب سے بڑے ناول نگار ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے دیہات کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ پریم چند کے ناولوں میں ''گئودان'' شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ پریم چند کے بعد کرشن چندر، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، عزیز احمد، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، جمیلہ ہاشمی، قاضی عبدالستار اور انتظار حسین اردو کے اہم ناول نگار ہیں۔

© NCERT not to be republished

ڈپٹی نذیر احمد

(1912–1831)

ڈپٹی نذیر احمد اُتّر پردیش کے ضلع بجنور، تحصیل نگینہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ریہڑ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی سعادت علی تھا۔ نذیر احمد کی ابتدائی تعلیم بجنور، مظفّر نگر اور دہلی میں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم دلّی کالج میں ہوئی جو اب ذاکر حسین کالج کے نام سے مشہور ہے۔

1854 میں تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے پنجاب کے ایک مدرسے میں مدرّسی کا پیشہ اختیار کیا۔ انگریز حکومت نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں 'شمس العلما' کا خطاب دیا۔ 1902 میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری تفویض کی۔

ڈپٹی نذیر احمد ناول نگار، ادیب، ترجمہ نگار اور مقرّر تھے۔ اردو کے ابتدائی اہم ناول نگاروں میں ان کا نام بہت نمایاں ہے۔ ''مراۃ العروس''، ''بنات النّعش''، ''توبتہ النّصوح'' اور ''ابن الوقت'' ان کے اہم ناول ہیں۔ ان کے ناول حقیقت پسندی، اخلاقی تربیت اور سماجی اصلاح کا مثالی نمونہ ہیں۔

© NCERT not to be republished

5287CH04

مرزا ظاہر دار بیگ

مرزا کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا، وہ بھی حقیقی نہیں، ابتداے عمل داریِ سرکار میں جناب ریزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اوّل تو ایسی عالی جاہ سرکار، دوسرے باعتبارِ منصب اردلی کا جمعدار۔ مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہوگئی تھی۔

جمعدار اگرچہ بہت کچھ وصیت کر مرے تھے، مگر اُن کے ورثا نے بہ ہزاردقّت محل سرا کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ اِس کے رہنے کو دیا اور سات روپے مہینے کے کرائے کی دکانیں مرزا کے نام کر دیں۔ یہ تو حال تھا کہ مرزا، مرزا کی ماں، مرزا کی بیوی، تین تین آدمی اور سات روپے کی کُل کائنات، اس پر مرزا کی شیخی اور نمؤد۔ یہ مسخرہ اس ہستی پر چاہتا تھا کہ جمعدار والوں کی برابری کر لے، جن کو صدہا روپے ماہوار کی آمدنی تھی۔ اگرچہ جمعدار والے اس کو مُنہ نہ لگاتے تھے، مگر یہ بے غیرت زبردستی اُن میں گھُستا تھا۔ ماں بے چاری بہتیرا، بکتی، مگر کون سُنتا تھا؟ مرزا کو جب دیکھو، پاؤں میں ڈیڑھ حاشیے کی جوُتی، سر پر دوہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی، بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگرکھے، اوپر ہلکی سی تن زیب نیچے کوئی طرح دار ڈھاکے کا نینو، جاڑا ہوا تو بانات، مگر سات روپے گز سے کم کی نہیں، ریشمی ازار بند، گھٹنوں میں لٹکتا ہوا اور اس میں قفل کی کنجیوں کا گچھّا۔ غرض دیکھا تو مرزا صاحب اس ہیئتِ کذائی سے چھیلا بنے ہوئے سرِ بازار چھم چھم کرتے چلتے جا رہے ہیں۔

کلیم سے اور مرزا سے محفلِ مشاعرہ میں تعارف ہوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے۔ یہاں تک کہ چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی کہ گویا ایک جان دو قالب تھے۔ کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی اتّفاق نہیں ہوا، مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی، لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے، اور تمام تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا اصلی حال کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کے محل سرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔ بار بار کے پکارنے اور کنڈی کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لیے ہوئے اندر سے نکلیں اور اُن میں سے ایک نے پوچھا، ''کون صاحب ہیں، اور اتنی رات گئے کیا کام ہے؟''

کلیم : ''جاؤ، مرزا کو بھیج دو۔''

لونڈی: ''کون مرزا؟''

© NCERT not to be republished

کلیم : ’’ مرزا ظاہر دار بیگ، جن کا مکان ہے اور کون مرزا؟‘‘

لونڈی: ’’یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں رہتا۔‘‘

اتنا کہہ کر، قریب تھا کہ لونڈی پھر کو اڑ بند کر لے کہ جلدی سے کلیم نے کہا، ’’ کیوں جی! کیا یہ جمعدار صاحب کی محل سرا نہیں؟‘‘

لونڈی: ’’ ہے کیوں نہیں؟‘‘

کلیم : ’’ پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں۔ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں؟‘‘

لونڈی: ’’جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے۔ موا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے؟‘‘

دوسری لونڈی: ’’ اری کم بخت! یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا ہے۔ (کلیم کی طرف مخاطب ہوکر) کیوں میاں! وہی ظاہر دار بیگ نا، جن کی رنگت زرد ہے، آنکھیں کرنجی، چھوٹا قد، دُبلا ڈیل، اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رکھتے ہیں۔‘‘

کلیم : ’’ ہاں ہاں، وہی ظاہر دار بیگ۔‘‘

لونڈی: ’’ تو میاں! اس مکان کے پچھواڑے، اُپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچّا مکان ہے، وہ اُس میں رہتے ہیں۔‘‘

(کلیم نے وہاں جا کر آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ جانگھیہ پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے، ’’اہا! آپ ہیں، معاف کیجیے گا، میں سمجھا کوئی اور صاحب ہیں۔ بندے کو کپڑے پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہم رکاب چلوں۔‘‘)

کلیم : ’’چلیے گا کہاں؟ میں آپ ہی کے پاس تک آیا تھا۔‘‘

مرزا : ’’ پھر اگر کچھ دیر تک تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرادوں؟‘‘

کلیم : ’’میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔‘‘

مرزا : ’’بسم اللہ تو چلیے، اسی مسجد میں تشریف رکھیے۔ بڑی فضا کی جگہ ہے۔ میں ابھی آیا۔‘‘

کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پُرانی چھوٹی سی مسجد ہے۔ مسجدِ ضرار کی طرح وحشت ناک، نہ کوئی حافظ ہے نہ مُلاّ، نہ طالب علم نہ مسافر، ہزار ہا چمگادڑیں اُس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھڑنجے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو

چاروناچار اسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے، مرزا صاحب فرمانے لگے کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو ان کو غشی میں پایا۔ اس وجہ سے دیر ہوئی۔ پہلے یہ تو فرمائیے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے؟''

کلیم نے باپ کی طلب، اپنا انکار، بھائی کی التجا، ماں کا اصرار، تمام ماجرا کہہ سُنایا۔

مرزا : '' پھراب کیا ارادہ ہے؟''

کلیم : '' سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے اور جو آپ کی صلاح ہو۔''

مرزا : '' خیر، بہت شب حرام، صبح تو ہو، آپ بے تکلف استراحت فرمائیے۔ میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں۔ مریضہ کی تیمارداری کے لیے اجازت دیجیے کہ آج اس کی علالت میں اشتداد ہے۔''

کلیم : '' یہ ماجرا کیا ہے؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دوہری محل سرائیں، متعدد دیوان خانے، کئی پائیں باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور کٹرے اور گنج اور دُکانیں اور سرائیں ہیں۔ میں تو جانتا ہوں عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جسے تم نے اپنی مِلک نہ بتایا ہو یا یہ حال کہ ایک متنفّس کے واسطے ایک شب کے لیے تمھیں جگہ میسر نہیں۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کیے، اُن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ جمعدار کے تمام تر کے پر تم قابض اور متصرّف ہو۔ لیکن میں اُس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمّہ بھی نہیں دیکھتا۔''

مرزا : '' آپ کو میری نسبت سے سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجّب کی بات ہے۔ اتنی مدت مجھ سے آپ سے صحبت رہی۔ مگر افسوس

© NCERT not to be republished

ہے کہ آپ نے میری طبیعت اور عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلافِ حالت جو آپ دیکھتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بندے کو جمعدار صاحب مرحوم ومغفور نے متبنّیٰ کیا تھا اور جانشین کر مرے تھے۔ شہر کے کل رؤسا اس سے واقف اور آگاہ ہیں۔ اُن کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں۔ بندے کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے۔ صحبتِ ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا، لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ، بندوبست کا حوصلہ نہیں، اسی روز سے اندر باہر واویلا مچی ہوئی ہے اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منا لے جائیں۔''

کلیم : ''لیکن آپ نے کبھی تذکرہ بھی نہیں کیا۔''

مرزا : ''اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلالِ مزاج سے بے بہرہ اور غیرت وحمیّت سے بے نصیب ٹھہرتا۔ اب آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوگی۔ اجازت دیجیے کہ میں جا کر بچھونا بچھوا دوں اور مریضہ کی تیمارداری کروں۔''

کلیم : ''خیر، مقامِ مجبوری ہے، لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجیے۔ تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔''

مرزا : ''چراغ کیا، میں نے تو لیمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا، لیکن گرمی کے دن ہیں پروانے بہت جمع ہو جائیں گے اور آپ زیادہ پریشان ہو جیے گا اور مکان میں ابابیلوں کی بھی کثرت ہے۔ روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے۔ تھوڑی دیر صبر کیجیے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔''

کلیم جب گھر سے نکلا تھا تو کھانا تیار تھا لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اُس نے کھانے کی مطلق پروانہ کی۔ بے کھاوے نکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود پوچھیں گے ہی تو کہہ دوں گا۔ مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا۔ کیوں کہ اوّل تو رات کچھ ایسی زیادہ نہیں گئی تھی۔ دوسرے اسے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے نکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجے کی تھی، لیکن مرزا قصداً اِس بات سے معترض ہی نہ ہوا اور کلیم بے چارے کا یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اُس کی انتڑیوں نے قُلْ ھُوَ اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عن قریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے تو بے چارے نے بے غیرت بن کر کہا،

''سنو یار! میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔''

مرزا : ''سچ کہو! نہیں، جھوٹ بہکاتے ہو۔''

کلیم : ''تمھارے سر کی قسم، میں بھوکا ہوں۔''

مرزا : ''مردِ خدا! تو نے آتے ہی کیوں نہیں کہا؟ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے؟ دوکانیں سب بند ہو گئیں اور جو ایک دو کُھلی بھی

ہیں تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی جن کے کھانے سے فاقہ بہتر۔ گھر میں تو آج آگ تک نہیں سُلگی، مگر ظاہراً تم سے بھوک کی سہار ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ دیوا شتہا کو زیر کرنا بہت ہمّت والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آئی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑ بھونجے کے یہاں سے گرما گرم چنے کی دال بنوالاؤں۔ بس ایک دھیلے کی مجھے اور تجھے دونوں کو کافی ہوگی، رات کا وقت ہے۔“

ابھی کلیم کچھ کہنے ہی نہ پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اُٹھ، باہر گئے اور چشم زدن میں چنے بُھنوا لائے۔ مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے، یا تو کم کے لائے یا راہ میں دو چار پھنکے لگائے، اس واسطے کہ کلیم کے روبہ رو دو تین مٹّھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا: ”یار! ہو بڑے خوش قسمت، اس وقت بھاڑ مل گیا۔ واللہ ذرا ہاتھ تو لگاؤ دیکھو کیسے بھلس رہے ہیں اور سوندھی سوندھی خوش بو، عجیب ہی دل فریب ہے کہ بس بیان نہیں ہوسکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹّی کا عطر نکالا۔ مگر بُھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ کوئی فن ہو، کمال بھی کیا چیز ہے۔ دیکھیے، اتنی رات گئی ہے مگر چھدامی کی دوکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندے نے بہ تحقیق سنا ہے کہ حضورِ والا کے خاصے میں چھدامی کی دوکان کا چنا بلا ناغہ لگ کر جاتا ہے اور واقع میں آپ ذرا غور سے دیکھیے کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی! تمھیں میرے سر کی قسم، سچ کہنا۔ ایسے خوب صورت خوش قطع، سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے؟ دال بنانے میں اُسے کمال حاصل ہے کہ کسی دانے پر خراش تک نہیں، ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور! دانوں کی رنگت دیکھیے، کوئی بسنتی ہے، کوئی پستئی، غرض دونوں رنگ خوش نما۔ یوں تو صدہا قسم کے غلّے اور پھل زمین سے اُگتے ہیں لیکن چنے کی لذّت کو کوئی نہیں پاتا۔“

غرض، مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا۔ کلیم بھوکا تو تھا ہی، اُسے بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزے دار معلوم ہوئے۔ مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیّر ہوجانا عبرت کا مقام ہے۔ یا تو خِلوت خانے اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آکر پڑا اور مسجد بھی ایسی، جس کا تھوڑا سا حال ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے۔ گھر کے الوانِ نعمت کو لات مار کر نکلا، تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ نہ چار پائی، نہ بہن نہ بھائی، نہ مونس نہ غم خوار، نہ نوکر نہ خدمت گار، مسجد میں اکیلا بیٹھا تھا جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہ گار یا قفس میں مرغ نوگرفتار۔ کوئی اور ہوتا تو اس حالت پر تنبیہ پکڑتا۔ اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے اعمال سے استغفار کرتا اور اسی وقت نہیں تو سویرے گجردم باپ کے ساتھ نماز میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوجھتے تھے۔ اس نے رات بھر میں ایک قصیدہ مسجد کی ہجو میں تیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں۔ صبح ہوتے آنکھ لگ گئی تو نہیں معلوم مرزا یا محلّے کا کوئی اور عیّار،

© NCERT not to be republished

ٹوپی، جوتی، رومال، چھڑی، تکیہ، دری یعنی جو چیز کلیم کے بدن سے منفک اور اس کے جسم سے جُدا تھی، لے کر چمپت ہوگیا۔ کلیم یوں بھی بہت دیر کو سو کر اُٹھتا تھا اور آج رات تو ایک خاص وجہ تھی۔ کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا تو دیکھتا ہے کہ فرشِ مسجد پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں، تو سیروں گرد کا بھبھوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تُھپا ہوا ہے۔ حیران ہوا کہ قلبِ ماہیت ہوکر کہیں بھتنا تو نہیں بن گیا۔ مرزا کو ادھر دیکھا، اُدھر دیکھا، کہیں پتا نہیں۔ مسجد بھی ویران، اس میں پانی کہاں؟ صبر کر کے بیٹھ رہا، کہ اللہ کا کوئی بندہ ادھر کو آ نکلے تو اس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں یا منہ ہاتھ دھوکر خود مرزا تک جاؤں۔ اس میں دوپہر ہونے کو آئی۔ بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا، جوں ہی زینے پر چڑھا کہ کلیم اس سے عرضِ مطلب کرنے کے لیے لپکا، وہ لڑکا اس کی ہیبت کذائی دیکھ، ڈر کر بھاگا۔ خدا جانے اس نے اسے بھوت سمجھا، یا سڑی خیال کیا، کلیم نے بہتیرا پکارا، اس لڑکے نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ ناچار کلیم نے بہ ہزار مصیبت دوسرے فاقہ سے شام پکڑی اور جب اندھیرا ہوا تو اُلّو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا، سیدھا مرزا کے مکان پر گیا اور آواز دی تو یہ جواب ملا کہ وہ تو بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں۔ کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کر کے ممکن ہو تو منہ ہاتھ دھونے کو پانی اور مرزا کی پھٹی پرانی جوتی مانگے تاکہ کسی طرح گلی کوچوں میں چلنے کے قابل ہو جائے۔ یہ سوچ کر اس نے کہا، ''کیوں حضرت! آپ مجھ سے بھی واقف ہیں؟'' اندر سے آواز آئی۔ ''ہم تمھاری آواز تو نہیں پہچانتے، اپنا نام و نشان بتاؤ تو معلوم ہو۔''

کلیم: ''میرا نام کلیم ہے اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بڑی دوستی ہے۔ بلکہ میں شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا۔''

گھر والے: ''وہ دری تکیہ کہاں ہے، جو رات تمھارے سونے کے لیے بھیجا گیا تھا؟''

تکیہ اور دری کا نام سُن کر کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں تامّل تھا کہ اندر سے آواز آئی، ''مرزا زبردست بیگ! دیکھنا یہ مردوا کہیں چل نہ دے، دوڑ کر تکیہ، دری تو اُس سے لو۔'' کلیم یہ بات سُن کر بھاگا۔ ابھی گلی کے نکّڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست بیگ نے چور چور کر کے جالیا۔ کلیم نے ہر چند مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوقِ معرفت ثابت کیے، مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر، اُس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔ کوتوال نے سرسری طور پر دونوں کا بیان سُنا اور کلیم سے اس کا بیان سُنا، پوچھا۔ کلیم ہر چند اپنا پتا بتانے میں جھینپتا تھا، مگر چار و ناچار اسے بتانا پڑا۔ لیکن اس کی حالتِ ظاہری ایسی غیر ہو رہی تھی کہ اُس کا سچ بھی جھوٹ معلوم ہوتا تھا۔

(نذیر احمد)

مشق

سوالات

1۔ مرزا ظاہر دار بیگ کا حلیہ لکھیے؟
2۔ کلیم کو جس مسجد میں ٹھہرایا گیا اس کی کیفیت لکھیے؟
3۔ ظاہر دار بیگ نے چنے کی تعریف میں کیا کہا؟
4۔ کلیم جب صبح سو کر اٹھا تو اس نے خود کو کس حالت میں پایا؟
5۔ اس قصّے سے مرزا ظاہر دار بیگ کے کردار کی کون سی خصوصیات سامنے آتی ہیں؟ لکھیے۔

© NCERT not to be republished

پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ

(1902–1846)

سرشارؔ لکھنؤ کے ایک معزّز کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ منشی نول کشور نے ان سے ''فسانۂ آزاد'' نام کا ایک ناول نما قصّہ اپنے اخبار کے لیے قِسطوں میں لکھوایا۔ تھوڑے ہی دنوں میں سرشارؔ کی دھوم مچ گئی۔ کہنے کو یہ لکھنؤ کے ایک نوجوان میاں آزاد کی داستان ہے۔ لیکن کتاب کا بڑا حصّہ دوسرے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات اور قصّہ در قصّہ کی طرح مناظر پر مشتمل ہے۔ کرداروں، واقعات اور جگہوں کی اس بھیڑ میں ہنسی مذاق بھی ہے۔ اس زمانے کی تہذیب کی طنزیہ یا ہمدردانہ تصویریں بھی ہیں، انگریزی اور ہندوستانی مزاج و تہذیب کا ایک دوسرے پر اثر اور ردِّ عمل بھی ہے۔ سرشارؔ کو ہر طرح کی زبان کے استعمال پر قدرت حاصل تھی۔ وہ موقع و محل کے لحاظ سے سلیس و سادہ، فارسی آمیز اور مرصّع عبارت بے تکلّف لکھتے تھے۔

© NCERT not to be republished

5287CH05

صَف شِکن بٹیر

میاں آزاد نواب کی ڈیوڑھی پر آئے اور آداب بجالائے۔ اتنے میں ایک چوب دار برہنہ سر، پریشان و مُضطر لپکتا ہوا آیا۔

’’خداوند! بڑا غضب ہوگیا۔‘‘ ’’کیا کہتے ہو؟‘‘ ’’کیا کہوں؟‘‘ ’’کہو، ایں! خیر ہے؟ بولو تو!‘‘

سب کا رنگ فق کہ خُدا ہی خیر کرے، نواب کا کلیجہ دہل گیا۔ ’’میاں! کچھ منہ سے بولو سر سے کھیلو، آخر کیا آفت آئی؟ کچھ معلوم تو ہو؟‘‘

چوب دار : (ہاتھ جوڑ کر) ’’جان بخشی ہو تو عرض کروں۔ بٹیر سب اُڑ گئے‘‘۔

نواب : (ہاتھ ملتے ہوئے) ’’سب؟ ارے سب اُڑ گئے؟ ہائے! میرے صف شکن کو جو ڈھونڈ لائے، ہزار نقد انقد پائے۔ اس وقت میں جیتے جی مر مٹا۔ اُف! بھائی اُف! ابھی سانڈنی سواروں کو حکم دو کہ پنج کوسی دورہ کریں، جہاں صف شکن ملے، سمجھا بجھا کر لے ہی آئیں۔‘‘

مُصاحب : ’’خداوند! سمجھانا کیسا؟ وہ بھی کوئی آدمی ہے کہ سمجھ جائے گا؟ جنور لاکھ پڑھے، پھر جنور ہے۔‘‘

نواب : ’’کوئی ہے۔‘‘

© NCERT not to be republished

رُفقا : حاضر پیرومرشد! خداوند! جی حضور۔

نواب : ''ان پر جوتے پڑیں۔ لو صاحب! ہم تو اس وقت گھبرائے ہوئے ہیں یہ بات کاٹتا ہے۔ صف شکن کو ایسے گدھوں سے زیادہ تمیز ہے۔''

رُفقا : ''حق ہے اے حضور! وہ تو عربی سمجھ لیتا ہے۔''

دوسرے بولے : ''خُداوند! اُسے قرآن کے کئی پارے یاد ہیں۔''

تیسرے نے کہا : ''قسم پنج تن پاک کی، میں نے اُسے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''

چوتھے : ''ایک دن ہنس رہا تھا۔''

پانچویں : ''اجی! ہم نے اُسے ڈنڈ پیلتے دیکھا ہے۔''

''نواب صاحب کو ان کُل باتوں کا یقین آ گیا۔ اُس مُصاحب بے چارے کی گدّی پر کئی گدّے پڑ گئے۔ بٹیر کیا اُڑ گیا کہ نواب صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ آنکھوں سے اشک جاری، ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں۔ کلیجہ بلیوں اچھل رہا ہے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔'' ہائے میرا صف شکن! پیارا صف شکن!''۔

مُصاحب : حضور کو یاد ہوگا، رمضان شریف کے مہینے میں اس نے دانہ تک نہ چھوا۔ حضور سمجھے تھے بوندا ہو گیا، مگر میں تاڑ گیا کہ پابند صوم وصلوٰۃ ہے۔

میر صاحب : پیرومرشد! یقین جانیے، پچھلے پہر سے سحر کا ذب تک حق حق کی آواز کا بک سے آیا کرتی تھی۔ غفور! تم کو بھی ہم نے کئی بار جگا کر سُنایا تھا کہ صف شکن یادِ خدا میں مصروف ہیں۔

غفور : ہاں میاں! پچھلے پہر سے حق حق کیا کرتے تھے، اور اکثر دیکھا تھا کہ سجدہ کر رہے ہیں۔

خوجی : جَلَّ جَلالہٗ۔ واہ میاں صف شکن علی شاہ۔

نواب : ہم نے اسے پہچانا ہی نہیں۔ اُف اُف! بھئی کوئی پنکھا جھلنا۔

مصاحبین : (غل مچا کر) پنکھا لاؤ جلدی۔ سامنے کھڑے ہو کر جھلو۔

نواب : پیتم! جو میں جانتی، کہ پیت کیے دُکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی، پیت کرے نہ کوئے

خوجی : (پینک سے چونک کر) ہاں ذری اونچے سُروں میں، واہ اُستاد! چھیڑے جا۔ اس وقت تو میاں شورؔی کی

روٗح پھڑک گئی ہوگی۔

نواب : چُپ نامعقول! کوئی ہے؟ ان کو یہاں سے ٹہلاؤ۔ یہ رئیسوں کی صُحبت کے قابل نہیں۔ یہاں تو جی جلتا ہے، اندر ہی اندر پک رہا ہوں۔ ان کے نزدیک قوّالی ہورہی ہے، کہنے لگے، ''اونچے سُروں میں، میاں شوری یاد آتے ہیں۔'' تم ایسے مُفت خوروں کو کسی کے دکھ درد سے کیا سروکار؟ تم کو تو چکھوتیوں سے مطلب ہے۔ اور بس فیرنی ہو، کھیر پکے، مزعفر پر ہاتھ پڑے۔ ٹکڑے کھائے، دل بہلائے، کپڑے پھٹے، گھر کو آئے۔

خوجی : خُداوند! غُلام تو اس وقت آپے میں نہیں۔ ہائے! صف شکن کی کابک خالی ہو اور میں اپنے ہوش وحواس سے چوکس رہوں۔ میرا معشوق نظر سے غائب ہو تو طبیعت کیوں کر حاضر ہو؟ حضور نے اس وقت مجھ پر جبر کیا، افسوس! ہائے افسوس! ارے یارو! صف شکن کو کہیں سے ڈھونڈھ لاؤ۔ کوئی تو پتہ لگاؤ۔ چورگیدی سے خُدا سمجھے۔

نواب : شاباش! خوجی، شاباش! اس وقت طبیعت بہت ہی خوش ہوگئی۔ بے شک تم نمک حلال، تمھارے باپ دادا نمک حلال۔ ارے بھئی! سانڈنی سوار دوڑائے گئے یا نہیں؟۔

مصاحب : شجاعت علی سے کہو ابھی سانڈنی تیار ہو اور پنج کوسی چکّر لگائے، جہاں صف شکن ملیں انھیں سمجھا بجھا کرلے ہی آئے۔

شجاعت علی : جاتا تو ہوں، مگر وہ منطق پڑھے ہیں۔ میری کیا سنیں گے؟ کوئی مولوی بھی ساتھ بھیجیے۔ اُن سے بحث گا کون؟ غلام تو کچھ اونٹ چلانا ہی خوب جانتا ہے۔ اُن سے دلیل کون کرے گا بھلا؟۔

میاں آزاد : پیرومُرشد! بانک، بنوٹ، لکڑی، پٹے کا چرچا ہوتا تو بندہ بھی تلوار سونت کر عین موقعۂ واردات پر جاڈٹتا اور چرکے پر چرکا، نشتر پر نشتر لگاتا۔ منطق کی بحث کچھ خالہ جی کا گھر تو ہے نہیں، کسی بُغادری مولانا کو بُلوائیے۔

مصاحبوں نے ایک مولانا کو تجویزا۔ مولانا بچارے پھٹے حالوں تھے، سمجھے کہ جو ملے غنیمت ہے، مگر یاران سرپُل نے اُن سے کُل داستان نہیں بیان کی۔ چوب دار مکان پر گیا اور کہا نواب صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے چلیے! کسی بڑے عالم سے بحث ہوگی۔

مولانا : السّلام علیکم! حضور نے آج یاد فرمایا ہے۔ زہے نصیب۔

نواب : وعلیکم السّلام! آپ کو اس وجہ سے تکلیف دی ہے کہ میرا قُرّۃُ العین، لختِ جگر، نورِ بصر ناراض ہوکر چلا گیا۔ مگر بہت منطقی ہے۔ اسرار خُدائی سے واقف، علم مناظرہ میں طاق، پابند روزہ نماز، آپ بحث کیجیے اور معقول کرکے اُسے لائیے۔

مولانا : انشاءاللہ! والدین کا بڑا حق ہوتا ہے۔ وہ کیسے نادان آدمی ہیں کہ والدین سے خفا ہوگئے؟ مقامِ اِستعجاب ہے۔

خوجی : مولانا صاحب! وہ بٹیر ہے، مگر خوش تمیز، عارف، زاہد، عفّت کوش، متّقی مشرّع، منطقی، فلسفی، ہئیت داں، عربی خواں۔

میر صاحب : کیا صف شکن کا نام مولانا نے نہ سُنا ہوگا؟ وہ تو روُم تک مشہور تھے۔

قبلہ! حقیقت حال یوں ہے کہ سرکار کا بٹیر صف شکن کل کا بک سے اُڑ گیا۔ اب تجویز یہ ہوئی ہے کہ ایک سانڈنی سوار جائے اور سمجھا بجھا کر لے آئے، مگر شتربان پھر شتربان ہے، لاکھ صُحبت یافتہ ہو تو کیا! لہٰذا، آپ بلائے گئے کہ سانڈنی پر سوار ہو جیے، اور اُن کو بہ لطائف الحیل بلا لائیے۔

مولانا : درست، آپ سب کے سب نشے میں تو نہیں؟ ہوش کی باتیں کیجیے۔ خود مسخرے بنتے ہو یا مجھے مسخرا بناتے ہو۔ بٹیر منطقی کیسا؟ لاحَولَ وَلاقوۃ۔ اور سُنیے، بٹیر اُڑ گیا، اُس کو سمجھا کر لاؤ۔ وہ بھی کوئی مولوی ہے یا آدمی ہے؟ صف شکن! کون لڑائی سر کی تھی؟ استغفراللہ! استغفراللہ! اچھے گاوَدیوں کا مجمع ہے۔ بندہ رخصت ہوتا ہے۔

نواب : یہ کس کوڑھ مغز کو لائے تھے؟ خاصا جانگلو ہے۔

آزاد : اچھا! حضور بھی کیا خیال کریں گے اتنے بڑے دربار میں ایک بھی منطقی نہ نکلا، لو! اب غلام نے بیڑا اُٹھا لیا کہ جاؤں گا اور لاؤں گا۔ ایک تو سانڈنی دیجیے۔ بادرفتار، اور دو دن کی خوراک دیجیے، اور ایک خط اپنے دست مبارک سے لکھ دیجیے۔ تیسرے دن غلام مع صف شکن بہادر کے ڈیوڑھی پر موجود نہ ہو، تو مونچھیں منڈا دیجیے۔

نواب : اچھّا آپ جائیے اور لیس ہو کر آئیے۔ میں یہاں بندوبست کیے دیتا ہوں۔ مگر ابھی آئیے، دیر نہ ہونے پائے، اتنا خیال رہے۔

میاں آزاد گھر گئے اور مصاحبوں میں کھچڑی پکنے لگی۔ ''یارو! یہ تو بازی جیت لے گیا۔ پالا اسی کے ہاتھ رہا۔ اور جو کہیں صف شکن کو لے آیا، تو پھر ہم سب پر شیر ہوجائے گا۔ پھر آزاد ہی آزاد چوطرفہ نظر آئیں گے۔ ہم کو، آپ کو، کوئی نہ پوچھے گا۔ اس کی فکر کیجیے۔''

خوجی : ''حضور! جاں بخشی ہو تو عرض کروں۔''

نواب : ''کہیے نا۔ یہ جاں بخشی کا کون سا موقع ہے؟ کوئی عُمدہ صلاح بتائیے، کوئی معقول تدبیر نکالیے۔''

خوجی : حضور! میاں آزاد، ابھی دو دن سے اس دربار میں آئے ہیں۔ اُن کا اِعتبار کیا؟ خُدا جانے اچکّے ہیں، اُٹھائی گیرے ہیں، چور ہیں، گرہ کٹ ہیں، کوئی کیا جانے؟ اور جو سانڈنی ہی لے کر رفو چکّر ہوں، تو پھر کوئی کہاں ان کا پتہ لگاتا پھرے گا؟ انصاف سے کہیے گا کہ ایک خانہ برباد، خانہ بہ دوش آدمی کا ٹھکانا کیا؟ اور وہ کچھ

© NCERT not to be republished

بیدھا ہے کہ واپس آئے گا؟''

مُصاحب : ہاں خداوند! سچ تو سچ ہے۔

میر صاحب : یہ خوجی صورت ہی سے کچھ ایسے معلوم ہوتے تھے، مگر بات کہی ٹھکانے کی۔

مسیتا بیگ : ہم تو حضور کو صلاح نہیں دیں گے، کہ میاں آزاد کو سانڈنی دیجیے۔

نواب : چلو، بس بہت نہ بکو! تم اُٹھائی گیرے، مفت خورے ہونا۔ سب کو اپنا ہی ایسا سمجھتے ہو۔ آزاد کی چتون کہے دیتی ہے کہ وہ وزارت کے قابل ہے۔ تم میں سے کوئی اس کی جوتی کی پھٹ پھٹ کو نہیں پہنچتا، اور فرض کرو کہ سانڈنی جاتی ہی رہے تو کیا میں بھی کوئی ٹکڑ گدا ہوں کہ سانڈنی کے کھونے سے مجھے بھیک مانگنے کی نوبت آجائے گی؟ اور ہزاروں کی ایک بات تو یہ ہے کہ صف شکن پر سے لاکھوں صدقے ہیں۔ سانڈنی کس شمار میں ہے۔

ہمارے سیلانی جوان، رنگیلے پہلوان، ظریفوں کی جان، زندہ دلوں کی روح رواں، میاں آزاد نے سانڈنی پر کاٹھی کسی، اور بھولے بھالے، دیوانے، متوالے نواب سے رُخصت ہوئے۔

میر صاحب : ذری، سانڈنی سے چوکس رہیے گا۔

آزاد : خُداوند! رُخصت، مجرا عرض ہے غلام کے حق میں دعائے خیر کیجیے۔

نواب : خُدا حافظ و ناصر ہے، اور میرا تو رونگٹا رونگٹا دُعا دے رہا ہے۔ لیجیے بسم اللہ کیجیے۔

میاں آزاد نے پُشت پھیری تھی کہ اتنے میں پٹ سے چھینک پڑی۔ ہات تیری کی ناک کاٹوں، ہتّھے پر ٹو کا کم بخت نے، لے میاں ذری جوتا بدل ڈالو، اور یہ گلوری کھالو۔ میاں آزاد پھر سب سے رخصت ہوئے۔ فی امان اللہ! خُدا حافظ! اللہ کو سونپا، مگر سانڈنی کی خیر نہیں نظر آتی۔ بی مبارک قدم، لونڈی اور ماما، اصیلوں نے چٹ چٹ بلائیں لیں اور دعائیں دیں۔

الغرض میاں آزاد سانڈنی پر سوار ہو کر ہوا ہوئے۔ یہ جا وہ جا۔ تھوڑی دیر میں نظر سے اوجھل۔

جب کئی دن گزر گئے، تو خوشامد خوروں نے چنگ پر چڑھایا، پیر و مُرشد! دیکھا، ہم نہ کہتے تھے کہ میاں آزاد، خانہ برباد کا ٹھکانہ کیا؟ حضور نے نہ مانا، آخرش سانڈنی کی سانڈنی گئی، اور رنج کا رنج ہوا۔

خوجی : اور بے وقوف کے بے وقوف بنے۔

میر صاحب : اور انعام جو دیا گیا، اُس کی گنتی ہی نہیں۔

© NCERT not to be republished

غفور : ہجور! اب وہ پھرتے نجر نہیں آتے۔ دو تین سو کی سانڈنی پر پانی پھر گیا۔

خوجی : ہونہہ! یہ دو ہی تین سو لیے پھرتے ہیں۔ اے میاں! وہ سانڈنی بلا کی دھاوا کرنے والی ہے۔ ریل کی دُم میں باندھ دو، دیکھو چندوسی تک برابر چھم چھم کرتی چلی جاتی ہے یا نہیں؟ ہندوستان سے ملک میں ویسی تو ایک نظر نہیں آتی۔ کیا دم خم ہے؟

نواب : اتنے بڑے لونبڑے ہوئے مگر گھو کے ہی رہے۔ جو بات کریں گے، بے ٹھکانے۔ سانڈنی، ٹکے کا جانور، گئی گئی۔ اب اُس کا رونا کیا؟ ہائے! رنج تو یہ ہوا کہ میاں صف شکن اب ہاتھ نہیں آنے کے۔ میرا ہی دل جانتا ہے کہ کلیجے پر کیسی چوٹ لگی ہے؟ بھئی! اس سے تو مجھے موت ہی آجاتی تو سمجھتا، بڑا خوش نصیب ہوں افسوس!۔

مصاحب : حضور! صبر کیجیے۔ بڑے نواب صاحب مر گئے، تو حضور نے کیا کرلیا؟ چچا، حضور کو چھوڑ کر چل بسے، تو حضور نے کیا کرلیا؟ داداجان، ساری ثروت سے منہ موڑ کر داغِ جُدائی دے گئے، تو حضور نے کیا کرلیا؟ اب صبر کیجیے۔

نواب : میاں! باپ دادا تو سب ہی کے مرا کرتے ہیں، مگر صف شکن سے وفادار جانور کا ایک دم بھی جُدا ہونا کھلتا ہے، نہ کہ کا یک سے اُڑ جانا۔ خیر، خُدا اُن کو بخشے۔ اس وقت دل ہے کہ بے اختیار اُمڈا چلا آتا ہے۔

خوجی : اس وقت تہہ دل سے دُعا نکلتی ہے کہ میاں آزاد مع صف شکن علی شاہ کے کھٹ سے آجائیں، اور حضور، واللہ! دل گواہی دیتا ہے کہ آیا ہی چاہتے ہیں۔ بس صبح و شام آئے، داخل۔

نواب : تمھارے منہ میں گھی شکّر۔

مسیتا : حضور! مٹھائی کا اقرار کرلیں۔

خوجی : اور سنیے! یہ اب مٹھائی کیسی؟ وہ جلسے اڑیں، وہ جشن ہوں کہ واہ جی واہ! مہینوں طبلے پر تھاپ پڑے، اور دور دور سے طائفے آئیں۔ صف شکن کا آنا کوئی ایسی ویسی بات ہے؟ گیدی کہیں کا۔

نواب : انشاء اللہ! پھر میں اپنے دل کا ارمان نکالوں۔ وہ دھما چوکڑی مچے کہ واہ جی، واہ۔

الغرض، میاں آزاد کا خط لے کر چابک سوار نواب کی خدمت میں حاضر ہوا۔

چابک سوار : مجرا عرض ہے۔

نواب : سلام! کہو! بیٹا کہ بٹی؟ جلدی سے بولو، یہاں پیٹ میں چوہے کود رہے ہیں۔

چابک سوار : حضور! غلام نے راہ میں دم لیا ہو، تو جرمانہ دوں، بس گھوڑے کی پیٹھ پر آیا اور کڑکڑا دیا۔

خوجی : کتنے بے تکے ہو میاں! سوال دیگر جواب دیگر، کہیں کھیت کی، سنیں کھلیان کی۔ بھلا اپنی کارگزاری جتانے کا یہ کون سا موقع ہے؟ جی آزاد کا پتہ بتاؤ، مارے شیخی کے دُبلے ہوئے جاتے ہیں۔

اب سنیے کہ میاں آزاد اپنی سانڈنی پر سوار، صف شکن علی شاہ کو کابک میں بٹھائے سڑک پر ڈٹے ہوئے تھے۔ ایں! صف شکن علی شاہ کہاں سے آ گئے؟ اجی کسی اٹیر بٹیر کو ادھر ادھر سے خرید لیا ہوگا۔

ناصاحب! وہی صف شکن۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ میاں آزاد نے اور سب بٹیروں کو تو اُڑا دیا تھا، مگر صف شکن علی شاہ کو چھپا رکھا تھا، اب موقع پر اُن کو نکالا۔ خیر، خوجی آتے ہی اُن سے بغل گیر ہوئے اور میر صاحب گلے ملے، اور غفور خدمت گار نے سلام کیا اور رفقا و مُصاحبین سے مصافحہ ہوا۔

خوجی : مثل مشہور ہے کہ سو برس بعد گھورے کے دن بھی بہورتے ہیں۔ سو ہمارے تو آج دن بہورے کہ آپ آئے اور شاہ جی لائے، نواب کے یہاں سناٹا پڑا ہوا تھا۔ وہ چہل پہل ہی نہیں، وہ دل لگی ہی نہیں، صف شکن کے سوگ میں سب پر مُردنی چھائی تھی نواب چونک چونک پڑتے تھے۔ کھٹ ہوا اور پوچھا۔ ''آزاد آئے۔'' دھم ہوا اور کنمنائے مگر آپ نہ آئے۔

آزاد : بھائی! کچھ پوچھو نہیں۔ واللہ! آسمان میں تھگلی لگائی تب کہیں ان کی زیارت نصیب ہوئی، خدا جانے کن کن جنگلوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اور وہاں کیا کیا اُفتادیں پڑیں۔

خلاصہ یہ کہ خوجی اور میر صاحب اور رفقا اور مُصاحبین سب کے سب مل کر میاں آزاد کو چیتے یار بناتے تھے، مگر ہمارے آزاد ایک ہی استاد تھے۔ خوب سمجھے کہ اب نواب کے یہاں ہمارا جو طوطی بولے گا، اُس سے یہ سب ہمارے پارچے بن رہے ہیں۔ تھوڑی دیر تک تو خوب گھل گھل کر باتیں ہوئیں، تو میاں آزاد نے کہا: حضرت! اب رات جاتی ہے یا آتی ہے، چلیے نا، بس اب انتظار کس کا ہے؟ اچھا بسم اللہ کیجیے، پشاخے چڑھاؤ، لالٹینیں جلاؤ، گھوڑے چلاؤ، ہاتھی کے پرے جماؤ، باجا بجاؤ، تامدان بڑھاؤ، سب قرینے سے لگاؤ، جب جلوس آراستہ ہوا تو میاں آزاد ایک فیل فلک شکوہ پر جا ڈٹے اور صف شکن علی شاہ کی کابک کو آگے رکھ لیا۔ شہر میں تو پہلے ہی سے ہلّڑ تھا کہ نواب والا بٹیر بڑے ٹھسے سے آ رہا ہے۔ لاکھوں آدمی چوک میں تماشا دیکھنے کو ڈٹے ہوئے تھے۔ چھتیں پھٹی پڑتی تھیں۔ وہ بھیڑ بھڑکّا کہ شانہ سے شانہ چھلتا تھا۔ باجوں کی آواز جو کانوں میں پڑی تو تماشائی چشمِ درانتظار ہوئے۔

© NCERT not to be republished

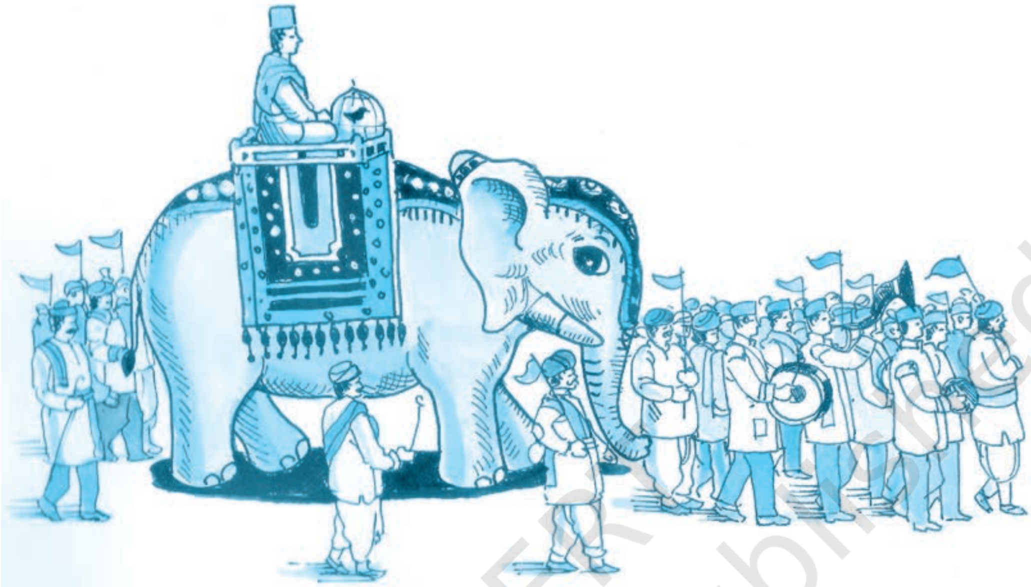

نشان کا ہاتھی جھنڈے کا پھریرا اُڑاتا، اٹکھیلیاں کرتا، سامنے آیا۔ پھولوں کے تخت آ گئے تھے۔ انگریزی باجے نے کانوں کو سرور، نازنینانِ پری وش کے رُخِ انور نے آنکھوں کو نور بخشا۔

(پنڈت رتن ناتھ سرشار)

مشق

سوالات

1۔ نواب صاحب کے رفیقوں نے صف شکن کی تعریف میں اس کی کیا کیا خصوصیات بتائیں؟ کوئی پانچ خصوصیات لکھیے۔

2۔ مولانا کو کیوں بُلایا گیا تھا اور اس پورے معاملے پر ان کا ردِعمل کیا تھا؟

3۔ صف شکن کو واپس لانے کی ذمہ داری کس نے لی اور اس کام کے لیے کیا کیا چیزیں طلب کیں؟

4۔ مصاحبوں نے نواب صاحب کو آزاد کے خلاف بھڑکانے کے لیے اس کی بُرائی میں کیا کیا کہا؟

5۔ صف شکن کو آزاد کہاں سے ڈھونڈ کر لائے؟ تفصیل سے بتائیے۔

© NCERT not to be republished

انشائیہ

لفظ انشا اردو میں کئی طرح سے استعمال ہوتا ہے۔ انشائیہ بھی اسی لفظ سے بنا ہے۔

ابتدا میں مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری میں زیادہ فرق نہیں تھا، مگر رفتہ رفتہ ان میں فرق پیدا ہوتا گیا، یہاں تک کہ انشائیہ ایک علاحدہ صنف قرار پائی۔ انشائیہ نگار اپنے مخصوص ذاتی مشاہدات اور تاثرات کو بے باکی اور بے تکلفی سے بیان کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انشائیہ میں سنجیدہ اور غیر سنجیدہ موضوعات سے متعلق خیال کے تمام مرحلے خوش طبعی کے ساتھ طے کیے جاتے ہیں۔ یہ بات میں بات پیدا کرنے کا فن ہے۔ انشائیہ نگار مفہوم سے خالی گفتگو میں بھی معنی پیدا کر دیتا ہے لیکن کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ اختصار اس کی پہچان ہے۔ اس میں مزاح یا ٹھٹھول کی جگہ ہلکی پھلکی زیرِ لب ہنسی پنہاں ہوتی ہے۔ خیال آفرینی اس کی ایک اہم خوبی ہے۔

اردو میں انشائیے کی ابتدا سر سید احمد خاں کے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' سے ہوتی ہے۔ مولوی نذیر احمد اور ذکاء اللہ کے بعد ''اودھ پنچ'' اور ''مخزن'' نے اسے فروغ دیا۔ میر ناصر علی، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، سجاد انصاری، نیاز فتح پوری، مہدی افادی، فرحت اللہ بیگ، قاضی عبدالغفار، پطرس بخاری، سید محفوظ علی بدایونی، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی، مشتاق احمد یوسفی، احمد جمال پاشا، یوسف ناظم، شفیقہ فرحت اور مجتبیٰ حسین نے اس صنف کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

© NCERT not to be republished

ابوالکلام آزاؔد

(1958-1888)

مولانا ابوالکلام آزاؔد کا اصل نام محی الدین احمد، کنّیت ابوالکلام اور تخلص آزاؔد تھا۔ وہ مکّۂ معظّمہ میں پیدا ہوئے۔ کچھ مدّت کے بعد ان کے والدین کولکاتا اور پھر دہلی آ گئے۔ مولانا کا خاندان علم وفضل کی برکتوں سے مالا مال تھا۔ ان کی تعلیم وتربیت گھر کے علمی ماحول میں ہوئی۔ انھوں نے کئی زبانوں اور مختلف علوم کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاؔد کا شمار اپنے وقت کی ذہین ترین شخصیایت میں ہوتا ہے۔ تصنیف وتالیف کا شوق بچپن سے تھا۔ اخبارات ورسائل میں مضامین کی اشاعت کے ساتھ ہی پورے ملک میں ان کے طرزِ تحریر کی دھوم مچ گئی۔ مولانا آزاؔد کے اخبارات ''لِسان الصّدق''، ''الہلال'' اور ''البلاغ'' اپنی انفرادیت کی وجہ سے ایسے مشہور ومقبول ہوئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے مولانا دنیائے صحافت پر چھا گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاؔد ایک بے مثال صحافی ہی نہیں، ایک جیّد عالِم، عظیم مفکّر، جادوٗ بیان مُقرّر، صائب الرّائے دانشور اور بے باک سیاست داں تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اپنی زبان اور قلم کے ذریعے اہلِ وطن کے دلوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کے سبب وہ بار بار نظر بند کیے گئے اور جیل بھیجے گئے۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے اہم رہنما تھے۔ 1939ء میں کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ آزادی کے بعد ہندوستان کے پہلے مرکزی وزیرِ تعلیم بنائے گئے۔

مولانا کی تصانیف میں ''تذکرہ''، ''ترجمان القرآن''، ''کاروانِ خیال''، ''ہماری آزادی'' اور ''غبارِ خاطر'' بہت مشہور ہیں۔

© NCERT not to be republished

5287CH06

چڑیا چڑے کی کہانی

آیئے، آج آپ کو چڑیا چڑے کی کہانی سُناؤں:

یہاں کمرے جو ہمیں رہنے کو ملے ہیں، پچھلی صدی کی تعمیرات کا نمونہ ہیں۔ چھت لکڑی کے شہتیروں کی ہے اور شہتیروں کے سہارے کے لیے محرابیں ڈال دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جا بجا گھونسلا بنانے کے قدرتی گوشے نکل آئے، اور گوریّاؤں کی بستیاں آباد ہوگئیں۔ دن بھر ان کا ہنگامۂ تگ ودوگرم رہتا ہے۔ یہاں کی ویرانی دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آگئی:

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

گذشتہ سال جب اگست میں یہاں ہم آئے تھے، تو ان چڑیوں کی آشیاں سازیوں نے بہت پریشان کر دیا تھا۔ کمرے کے مشرقی گوشے میں منہ دھونے کی ٹیبل لگی ہے۔ ٹھیک اس کے اُوپر نہیں معلوم کب سے ایک پُرانا گھونسلا تعمیر پا چکا تھا۔ دن بھر میدان سے تنکے چُن چُن کر لاتیں اور گھونسلے میں بچھانا چاہتیں۔ وہ ٹیبل پر گر کے اسے کوڑے کرکٹ سے اٹ دیتے۔ ادھر پانی کا جگ بھروا کے رکھا، اُدھر تنکوں کی بارش شروع ہوگئی۔ پچھّم کی

© NCERT not to be republished

طرف چارپائی دیوار سے لگی تھی، اس کے اُوپر نئی تعمیروں کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ ان نئی تعمیروں کا ہنگامہ اور زیادہ عاجز کردینے والا تھا۔ ان چڑیوں کو ذرا سی تو چونچ ملی ہے اور مٹھی بھر کا بھی بدن نہیں لیکن طلب وسعی کا جوش اس بلا کا پایا ہے کہ چند منٹوں کے اندر بالشت بھر کلفات کھود کے صاف کردینگی۔

پہلے دیوار پر چونچ مار مار کے اتنی جگہ بنالیں گی کہ پنجے ٹیکنے کا سہارا نکل آئے پھر اس پر پنجے جما کر چونچ کا پھاوڑا چلانا شروع کردیں گی، اور اس زور سے چلائیں گی کہ سارا جسم سُکڑ سُکڑ کر کانپنے لگے گا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دیکھیے، تو کئی انچ کلفات اُڑ چکی ہوگی۔ مکان چونکہ پرانا ہے، اس لیے نہیں معلوم، کتنی مرتبہ چونے اور ریت کی تہیں دیوار پر چڑھتی رہی ہیں۔ اب مل ملا کر تعمیری مسالے کا ایک موٹا سا دل بن گیا ہے۔ ٹوٹتا ہے تو سارے کمرے میں گرد کا دھواں پھیل جاتا ہے اور کپڑوں کو دیکھیے تو غبار کی تہیں جم گئی ہیں۔

چند دنوں تک تو میں نے صبر کیا لیکن پھر برداشت نے صاف جواب دے دیا اور فیصلہ کرنا پڑا اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں۔

یہاں میرے سامان میں ایک چھتری بھی آ گئی ہے، میں نے اٹھائی اور اعلانِ جنگ کردیا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوگیا کہ اس کوتاہ دستی کے ساتھ ان حریفانِ سقف و محراب کا مقابلہ ممکن نہیں۔ حیران ہوکر کبھی چھتری کی نارسائی دیکھتا، کبھی حریفوں کی بلند آشیانی۔

اب کسی دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی۔ برآمدے میں جالا صاف کرنے کا بانس پڑا تھا۔ دوڑتا ہوا گیا اور اُسے اُٹھا لایا۔ اب کچھ نہ پوچھیے کہ میدانِ کارزار میں کس زور کا رن پڑا۔ کمرے میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اُٹھائے، اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

آخر میدان اپنے ہی ہاتھ رہا اور تھوڑی دیر کے بعد کمرہ ان حریفانِ سقف و محراب سے بالکل صاف تھا۔

اب میں نے چھت کے تمام گوشوں پر فتح مندانہ نظر ڈالی اور مطمئن ہوکر لکھنے میں مشغول ہوگیا۔ لیکن ابھی پندرہ منٹ بھی پورے نہیں گزرے ہونگے کہ کیا سنتا ہوں کہ حریفوں کی رجز خوانیوں اور ہوا پیمائیوں کی آوازیں پھر اٹھ رہی ہیں۔ سر اٹھا کے جو دیکھا، تو چھت کا ہر گوشہ ان کے قبضے میں تھا۔ میں فوراً اٹھا اور بانس لاکر پھر معرکۂ کارزار گرم کردیا۔

اس مرتبہ حریفوں نے بڑی پامردی دکھائی۔ ایک گوشہ چھوڑنے پر مجبور ہوتے، تو دوسرے میں ڈٹ جاتے لیکن بالآخر میدان کو پیٹھ دکھانی ہی پڑی۔ کمرے سے بھاگ کر برآمدے میں آئے اور وہاں اپنا لاؤلشکر نئے سرے سے جمانے لگے۔ میں نے وہاں بھی تعاقّب کیا۔ اور اس وقت تک ہتھیار ہاتھ سے نہیں رکھا کہ سرحد سے بہت دور تک میدان صاف نہیں ہوگیا تھا۔ اب دشمن کی

فوج تتر بتر ہوگئی تھی مگر یہ اندیشہ باقی تھا کہ کہیں پھر اکٹھی ہوکر میدان کا رُخ نہ کرے۔ تجربے سے معلوم ہوا تھا کہ بانس کے نیزے کی ہیبت دشمنوں پر خوب چھا گئی ہے جس طرف رُخ کرتا تھا اسے دیکھتے ہی کلمۂ فرار پڑھتے تھے۔ اس لیے فیصلہ کیا کہ ابھی کچھ عرصے تک اُسے کمرے میں رہنے دیا جائے۔ اگر کسی اکّا دکّا حریف نے رُخ کرنے کی جرأت بھی کی تو یہ سربفلک نیزہ دیکھ کر اُلٹے پاؤں بھاگنے پر مجبور ہوجائیگا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ سب سے پرانا گھونسلا منھ دھونے کی ٹیبل کے اوپر تھا۔ بانس اس طرح وہاں کھڑا کر دیا گیا کہ اس کا سرا ٹھیک ٹھیک گھونسلے کے دروازے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اب گو مستقبل اندیشوں سے خالی نہ تھا، تاہم طبیعت مطمئن تھی کہ اپنی طرف سے سروسامانِ جنگ میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔

اب گیارہ بج رہے تھے، میں کھانے کے لیے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو کمرے میں قدم رکھتے ہی ٹھٹھک کے رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سارا کمرہ پھر حریف کے قبضے میں ہے اور اس اطمینان و فراغت سے اپنے کاموں میں مشغول ہیں جیسے کوئی حادثہ پیش آیا ہی نہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جس ہتھیار کی ہیبت پر اس درجہ بھروسہ کیا گیا تھا وہی حریفوں کی کام جوئیوں کا ایک نیا آلہ ثابت ہوا۔ بانس کا سرا جو گھونسلے سے بالکل لگا ہوا تھا، گھونسلے میں جانے کے لیے اب دہلیز کا کام دینے لگا ہے۔ تنکے چن چن کر لاتے ہیں اور اس نوتعمیر دہلیز پر بیٹھ کر بہ اطمینانِ تمام گھونسلے میں بچھاتے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی چوں چوں بھی کرتے جاتے ہیں۔

اپنی وہمی فتح مندیوں کا یہ حسرت انگیز انجام دیکھ کر بے اختیار ہمّت نے جواب دے دیا۔ صاف نظر آ گیا کہ چند لمحوں کے لیے حریف کو عاجز کر دینا تو آسان ہے مگر ان کے جوشِ استقامت کا مقابلہ کرنا آسان نہیں اور اب اس میدان میں ہار مان لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا۔

اب یہ فکر ہوئی کہ ایسی رسم وراہ اختیار کرنی چاہیے کہ ان ناخواندہ مہمانوں کے ساتھ ایک گھر میں گزارا ہو سکے۔ سب سے پہلے چارپائی کا معاملہ سامنے آیا۔ یہ بالکل نئی تعمیرات کی زد میں تھی، پرانی عمارت کے گرنے اور نئی تعمیروں کے سروسامان سے جس قدر گردوغبار اور کوڑا کرکٹ نکلتا، سب کا سب اسی پر گرتا۔ اس لیے اسے دیوار سے اتنا ہٹا دیا گیا کہ براہ راست زد میں نہ رہے۔ اس تبدیلی سے کمرے کی شکل ضرور بگڑ گئی لیکن اب اس کا علاج ہی کیا تھا۔ جب خود اپنا گھر ہی اپنے قبضے میں نہ رہا تو پھر شکل وترتیب کی آرائشوں کی کسے فکر ہوسکتی تھی۔ البتہ منہ دھونے کے ٹیبل کا معاملہ اتنا آسان نہ تھا۔ وہ جس گوشے میں رکھا گیا تھا صرف وہی جگہ اس کے لیے نکل سکتی تھی۔ ذرا بھی ادھر اُدھر کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ مجبوراً یہ انتظام کرنا پڑا کہ بازار سے بہت سے جھاڑن منگوا کر رکھ لیے اور ٹیبل کی ہر چیز پر ایک جھاڑن ڈال دیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد انھیں اٹھا کر جھاڑ دیتا اور پھر ڈال دیتا۔

ایک جھاڑن اس غرض سے رکھنا پڑا کہ ٹیبل کی سطح کی صفائی برابر ہوتی رہے۔ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ فرش کی صفائی کا تھا لیکن اسے بھی کسی نہ کسی طرح حل کیا گیا۔ یہ بات طے کرلی گئی کہ صبح کی معمولی صفائی کے علاوہ بھی کمرے میں باربار جھاڑو پھر جانا چاہیے۔ ایک نیا جھاڑو منگوا کر الماری کی آڑ میں چھپادیا۔ کبھی دن میں دو مرتبہ کبھی تین مرتبہ کبھی اس سے بھی زیادہ اس سے کام لینے کی ضرورت پیش آتی۔ یہاں ہر دو کمرے کے پیچھے ایک قیدی صفائی کے لیے دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر وقت جھاڑو لیے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا اور اگر رہ بھی سکتا تو اس پر اتنا بوجھ ڈالنا انصاف کے خلاف تھا۔ اس لیے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا کہ خود ہی جھاڑو اٹھالیا اور ہمسایوں کی نظریں بچا کے جلد جلد دو چار ہاتھ ماردیے۔

ایک دن خیال ہوا کہ جب صلح ہوگئی تو چاہیے کہ پوری طرح صلح ہو۔ یہ ٹھیک نہیں کہ رہیں ایک ہی گھر میں اور رہیں بیگانوں کی طرح۔ میں نے باورچی خانے سے تھوڑا سا کچا چاول منگوایا اور جس صوفے پر بیٹھا کرتا ہوں اس کے سامنے کی دری پر چند دانے چھٹک دیے۔ پھر اس طرح سنبھل کے بیٹھ گیا جیسے ایک شکاری دام بچھا کے بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ دیر تک تو مہمانوں کو توجہ نہیں ہوئی؟ اگر ہوئی بھی تو ایک غلط انداز نظر سے معاملہ آگے نہیں بڑھا لیکن پھر صاف نظر آگیا کہ معشوقانِ ستم پیشہ کے تغافل کی طرح یہ تغافل بھی نظر بازی کا ایک پردہ ہے، ورنہ نیلے رنگ کی دری پر سفید سفید ابھرے ہوئے دانوں کی کشش ایسی نہیں کہ کام نہ کر جائے۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ گوریّا جب تفتیش اور تفحّص کی نگاہوں سے دیکھتی ہے تو اس کے چہرے کا کچھ عجیب سنجیدہ انداز ہوجاتا ہے۔ پہلے گردن اٹھا کے سامنے کی طرف دیکھے گی پھر گردن موڑ کے داہنے بائیں دیکھنے لگے گی پھر کبھی گردن کو مروڑ دے کر اوپر کی طرف نظر اٹھائے گی اور چہرے پر تفحّص اور استفہام کا کچھ ایسا انداز چھا جائے گا جیسے ایک آدمی ہر طرف متعجبانہ نگاہ ڈال کر

© NCERT not to be republished

اپنے آپ سے کہہ رہا ہو کہ آخر یہ معاملہ ہے کیا، اور ہو کیا رہا ہے؟

پھر کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ قدم بڑھنے لگے لیکن براہ راست دانوں کی طرف نہیں آڑے ترچھے ہو کر بڑھتے اور کترا کر نکل جاتے۔ گویا یہ بات دکھائی جا رہی تھی کہ خدانخواستہ ہم دانوں کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ صید سے کہیں زیادہ صیّاد کو اپنی نگرانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ جوں ہی ان کے قدموں کا رخ دانوں کی طرف پھرا، میں نے دم سادھ لیا، نگاہیں دوسری طرف کر لیں اور سارا جسم پتھر کی طرح بےحس و حرکت بنالیا۔ گویا آدمی کی جگہ پتھر کی ایک مورتی دھری ہے۔ کیونکہ جانتا تھا کہ اگر نگاہِ شوق نے مضطرب ہو کر ذرا بھی جلد بازی کی تو شکار دام کے پاس آتے آتے نکل جائے گا۔ یہ گویا نازِ حسن اور نیازِ عشق کے معاملات کا پہلا مرحلہ تھا۔

خیر، خدا خدا کر کے اس عشوۂ تغافل نما کے ابتدائی مرحلے طے ہوئے اور ایک بُتِ طنّاز نے صاف صاف دانوں کی طرف رخ کیا مگر یہ رخ کیا قیامت کا رخ تھا، ہزار تغافل اس کے جلو میں چل رہے تھے۔

ایک قدم آگے بڑھتا تھا تو دو قدم پیچھے ہٹتے تھے۔ میں جی ہی جی میں کہہ رہا تھا کہ التفات و تغافل کا یہ ملا جلا انداز بھی کیا خوب انداز ہے۔ کاش تھوڑی سی تبدیلی اس میں کی جاسکتی، دو قدم آگے بڑھتے، ایک قدم پیچھے ہٹتا۔

التفات و تغافل کی ان عشوہ گریوں کی ابھی جلوہ فروشی ہو ہی رہی تھی کہ ناگہاں ایک تنومند چڑے نے جو اپنی قلندرانہ بے دماغی اور رندانہ جرأتوں کے لحاظ سے پورے حلقہ میں ممتاز تھا، سلسلۂ کار کی درازی سے اکتا کر بے باکانہ قدم اٹھا دیا۔

اس ایک قدم کا اٹھنا تھا کہ معلوم ہوا جیسے اچانک تمام رکے ہوئے قدموں کے بندھن کُھل پڑے۔ اب نہ کسی قدم میں جھجک تھی، نہ کسی نگاہ میں تذبذب، مجمع کا مجمع بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا اور اگر انگریزی محاورے کی تعبیر مستعار لی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ حجاب و تامّل کی ساری برف اچانک ٹوٹ گئی یا یوں کہیے کہ پگھل گئی۔ غور کیجیے تو اس کارگاہِ عمل کے ہر گوشے کی قدم رانیاں ہمیشہ اسی ایک قدم کے انتظار میں رہا کرتی ہیں۔ جب تک یہ نہیں اٹھتا سارے قدم زمین میں گڑے رہتے ہیں یہ اُٹھا اور گویا ساری دنیا اچانک اُٹھ گئی۔

اس بزمِ سودوزیاں میں کامرانی کا جام کبھی کوتاہ دستوں کے لیے نہیں بھرا گیا۔ وہ ہمیشہ انھیں کے حصّے میں آیا جو خود بڑھ کر اٹھا لینے کی جرأت رکھتے تھے۔ شاد عظیم آبادی مرحوم نے ایک شعر کیا خوب کہا تھا:

یہ بزم مے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

اس چڑے کا یہ بے با کا نہ اقدام کچھ ایسا دل پسند واقع ہوا کہ اسی وقت دل نے ٹھان لی کہ اس مردکارِ سے رسم وراہ بڑھانی چاہیے۔ میں نے اس کا نام قلندر رکھ دیا۔ کیونکہ بے دماغی اوروارستگی کی سرگرانیوں کے ساتھ ایک خاص طرح کا بانکپن بھی ملا ہوا تھا اور اُس کی وضعِ قلندرانہ کو آب وتاب دے رہا تھا:

رہے اک بانکپن بھی بے دماغی میں تو زیبا ہے
بڑھا دو جبین و ابرو پر ادائے کج کلاہی کو

دوتین دن تک اسی طرح ان کی خاطر تواضع ہوتی رہی۔ دن میں دوتین مرتبہ دانے دری پر ڈال دیتا۔ ایک ایک کر کے آتے، اور ایک ایک دانہ چن لیتے۔ کبھی دانہ ڈالنے میں دیر ہوجاتی تو قلندر آکر چوں چوں کرنا شروع کر دیتا کہ وقت معہود گزر رہا ہے۔ اس صورت حال نے اب اطمینان دلا دیا تھا کہ پردۂ حجاب اُٹھ چکا وہ وقت دور نہیں کہ رہی سہی جھجک نکل جائے ع

اور کُھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

چند دنوں کے بعد میں نے اس معاملہ کا دوسرا قدم اٹھایا۔ خالی ٹین کا ایک ڈھکنا لیا، اس میں چاول کے دانے ڈالے اور ڈھکنا دری کے کنارے رکھ دیا۔ فوراً مہمانوں کی نظر پڑی۔ کوئی ڈھکنے کے پاس آکر منہ مارنے لگا، کوئی ڈھکنے کے کنارے پر چڑھ کر زیادہ جمعیت خاطر کے ساتھ چگنے میں مشغول ہوگیا۔ آپس میں رقیبانہ ردّوکد بھی ہوتی رہی۔ جب دیکھا کہ اس طریقِ ضیافت سے طبیعتیں آشنا ہوگئی ہیں تو دوسرے دن ڈھکنا دری کے کنارے سے کچھ ہٹا کر رکھا۔ تیسرے دن اور زیادہ ہٹا دیا اور بالکل اپنے سامنے رکھ دیا۔ گویا اس طرح بتدریج بعد سے قرب کی طرف معاملہ بڑھ رہا تھا۔

اتنا قرب دیکھ کر پہلے تو مہمانوں کو کچھ تامّل ہوا۔ دری کے پاس آ گئے مگر قدموں میں جھجک تھی اور نگاہوں میں تذبذب بول رہا تھا۔ لیکن اتنے میں قلندر اپنے قلندرانہ نعرے لگا تا ہوا آ پہنچا اور اس کی رندانہ جرأتیں دیکھ کر سب کی جھجک دور ہوگئی، گویا اس راہ میں سب قلندر ہی کے پیرو ہوئے۔ جہاں اس کا قدم اُٹھا، سب کے اُٹھ گئے۔

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تو پھر ایک قدم اور اٹھایا گیا اور دانوں کا برتن دری سے اٹھا کے تپائی پر رکھ دیا۔ یہ تپائی میرے بائیں جانب صوفے سے لگی رہتی ہے اور پوری طرح میرے ہاتھ کی زد میں ہے۔ اس تبدیلی سے خوگر ہونے میں کچھ دیر لگی۔ بار بار آتے اور تپائی کے چکّر لگا کے چلے جاتے۔ بالآخر یہاں بھی قلندر ہی کو پہلا قدم بڑھانا پڑا اور اس کا بڑھنا تھا کہ یہ منزل بھی پچھلی منزلوں کی طرح سب پر کھل گئی۔ اب تپائی کبھی تو ان کی مجلس آرائیوں کا ایوانِ طرب بنتی، کبھی باہمی معرکہ آرائیوں کا اکھاڑا۔ جب اس قدر نزدیک آ جانے کے خوگر ہوگئے تو میں نے خیال کیا، اب معاملہ کچھ اور بڑھایا جاسکتا ہے۔ ایک دن صبح یہ کیا

کہ چاول کا برتن صوفے پر ٹھیک اپنی بغل میں رکھ دیا اور پھر لکھنے میں اس طرح مشغول ہوگیا گویا اس معاملہ سے کوئی سروکار نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا سنتا ہوں کہ زور زور سے چونچ مارنے کی آواز آرہی ہے کنکھیوں سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہمارا پرانا دوست قلندر پہنچ گیا ہے اور بے تکان چونچ مار رہا ہے۔ ڈھکنا چونکہ بالکل پاس دھرا تھا اس لیے اس کی دُم میرے گھٹنے کو چھو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے یارانِ تیز گام بھی پہنچ گئے اور پھر تو یہ حال ہوگیا کہ ہر وقت دو تین دوستوں کا حلقہ بے تکلف میری بغل میں اچھل کود کرتا رہتا، کبھی کوئی صوفے کی پشت پر چڑھ جاتا، کبھی کوئی جست لگا کر کتابوں پر کھڑا ہو جاتا، کبھی نیچے اُتر آتا اور چوں چوں کرکے پھر واپس آجاتا۔ بے تکلّفی کی اس اچھل کود میں کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میرے کاندھے کو درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ سمجھ کر اپنی جست وخیز کا نشانہ بنانا چاہا لیکن پھر چونک کر پلٹ گئے یا پنجوں سے اُسے چُھوا اور اوپر ہی اوپر نکل گئے۔

بہر حال رفتہ رفتہ ان آہوانِ ہوائی کو یقین ہوگیا کہ یہ صورت جو ہمیشہ صوفے پر دکھائی دیتی ہے، آدمی ہونے پر بھی آدمیوں کی طرح خطرناک نہیں ہے۔ دیکھیے محبت کا افسوں جو انسانوں کو رام نہیں کرسکتا، وحشی پرندوں کو رام کر لیتا ہے۔

بارہا ایسا ہوا کہ میں اپنے خیالات میں محو، لکھنے میں مشغول ہوں۔ اتنے میں کوئی دلنشیں بات نوکِ قلم پر آگئی یا عبارت کی مناسبت نے اچانک کوئی پُر کیف شعر یاد دلا دیا اور بے اختیار اس کی کیفیت کی خود رفتگی میں میرا سر وشانہ ہلنے لگا یا منہ سے ''ہا'' نکل گیا اور یکا یک زور سے پروں کے اُڑنے کی ایک پُھرسی آواز سنائی دی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ ان یارانِ بے تکلف کا ایک طائفہ میری بغل میں بیٹھا بے تامّل اپنی اچھل کود میں مشغول تھا۔ اچانک انھوں نے دیکھا کہ یہ پتھر اب ہلنے لگا ہے تو گھبرا کر اُڑ گئے۔ عجب نہیں، اپنے جی میں کہتے ہوں، یہاں صوفے پر ایک پتھر پڑا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی آدمی بن جاتا ہے۔

(ابوالکلام آزاد)

مشق

سوالات

1۔ مصنف نے اپنے کمرے کا منظر کس طرح پیش کیا ہے؟
2۔ چڑیا چڑے کی کہانی میں مولانا آزاد نے چڑیا چڑے کی کس خوبی کو سب سے زیادہ اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے؟
3۔ مصنف نے قلندر کس کو اور کیوں کہا ہے؟
4۔ اپنے حریفوں سے صلح کرنے کے لیے مصنف نے کیا تدبیریں کیں؟
5۔ ’’آدمی ہونے پر بھی آدمیوں کی طرح خطرناک نہیں ہے۔‘‘ اس جملے سے مصنف کی کیا مراد ہے؟

© NCERT not to be republished

محمد حسین آزادؔ

(1910–1829)

محمد حسین آزادؔ اردو کے اہم ادیب اور شاعر تھے۔ وہ ذوقؔ دہلوی کے شاگرد اور دہلی اردو اخبار کے مدیر مولوی محمد باقر کے بیٹے تھے۔ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ابتدا میں انھوں نے ملازمت کے سلسلے میں مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ آخر میں وہ لاہور میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوگئے۔

لاہور میں انھوں نے انجمن پنجاب کی زیرنگرانی ایک نئے انداز کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں شاعر دیے گئے عنوانات پر نظمیں سناتے تھے۔یہیں سے اردو میں جدید نظم نگاری یا جدید شاعری کا آغاز ہوا۔

محمد حسین آزادؔ اچھے شاعر ہی نہیں بلند پایہ انشاپرداز بھی تھے۔ 'آبِ حیات'، 'دربارِ اکبری'، 'نیرنگِ خیال'، 'سخن دانِ فارس' وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔انھوں نے بچّوں کے لیے اردو ریڈرس اور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ محمد حسین آزادؔ صاحب طرز ادیب ہیں۔ان کی نثر شگفتہ اور سجی ہوتی ہے۔

© NCERT not to be republished

5287CH07

انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا

سُقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اَہلِ دُنیا کی مُصیبتیں ایک جگہ لاکر ڈھیر کردیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جولوگ اب اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کومصیبت اور پہلی مُصیبت کوغنیمت سمجھیں گے۔

ایک اور حکیم اس لطیفے کے مضمون کو اور بھی بالاتر لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کوآپس میں بدل سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مُصیبت کو اچھّا سمجھتا۔

میں ان دونوں خیالوں کو وُسعت دے رہا تھا اور بےفکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آگئی اور خواب میں دیکھتا ہوں کہ سُلطانِ افلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔خُلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہلِ عالم اپنے اپنے رنج والم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ایک میدان کہ میدانِ خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا، تجویز ہوا اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں میدان میں بیچوں بیچ میں کھڑا تھا اور اُن کے تماشے کا لُطف اُٹھارہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے لیکن جو بوجھ گرتا ہے مقدار میں اور بھی بڑا ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مُصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہوگیا۔

ایک شخص سوُکھا، سہما، دُبلاپے کے مارے فقط ہوا کی حالت ہورہا تھا، اس انبوہ میں نہایت چالاکی اور پُھرتی سے پھر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بڑی معلوم ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے تھا جس کا دامن، دامنِ قیامت سے بندھا تھا۔ اُس پر دیوزادوں اور جنّاتوں کی تصویریں، زردوزی کڑھی ہوئی تھیں اور جب وہ ہوا سے لہراتی تھیں تو ہزاروں عجیب وغریب صورتیں اُس پر نظر آتی تھیں۔ اُس کی آنکھیں وحشیانہ تھیں مگر نگاہ میں افسردگی تھی اور نام اُس کا وہم تھا۔ ہر شخص کا بوجھ بندھواتا تھا اور لدواتا تھا اور مقامِ مقرّرہ پر لے جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہم جنسوں اور ہم صورت بھائیوں کو جب بوجھوں کے نیچے گڑگڑاتے دیکھا اور ان مصیبتوں کے انبار کو خیال کیا تو بہت گھبرایا اور دل میں ایسا ترس آیا کہ بیان نہیں ہوسکتا۔

اس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اُس نے ذرا میرا دل بہلایا صورت بہلاوے کی یہ ہوئی کہ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص پُرانے سے چکن کے چُغے میں ایک بھاری سی گٹھری لیے آتا ہے۔ جب وہ گٹھری انبار میں پھینکی تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا۔ اُس کے پیچھے ایک اور شخص دوڑا آتا تھا، بدن سے پسینہ بہتا تھا، اور مارے بوجھ کے ہانپتا جاتا تھا۔ اُس نے بھی اپنا بوجھ سر سے پھینکا اور معلوم ہوا کہ وہ اس کی جورو تھی جو بہت بُری تھی اُس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے۔

ان کے بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جن کی تعداد کا شمار نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گروہ ہے۔ ان کے سروں پر دوُدِ آہ کی گٹھریاں تھیں کہ انھیں میں آہوں کے تیرِ خیالی اور نالوں کے نیزۂ وبالی دبے ہوئے تھے۔ اگر چہ یہ لوگ مارے بوجھ کے اس طرح درد سے آہیں بھرتے تھے کہ گویا اَب سینے ان کے پھٹ جائیں گے لیکن تعجب یہ ہے کہ جب اس انبار کے پاس آئے تو اتنا نہ ہوسکا کہ ان بوجھوں کو سر سے پھینک دیں۔ کچھ جدّ وجہد سے سر ہلایا مگر جس طرح لدے ہوئے آئے تھے اسی طرح چلے گئے۔ بہت بُڑھیاں دیکھیں کہ بدن کی جُھرّیاں پھینک رہی تھیں۔ چند نوجوان اپنی کالی رنگت، کچھ موٹے موٹے ہونٹ، اکثر ایسے میل جمے ہوئے دانت پھینکتے تھے کہ جنھیں دیکھ کر شرم آتی تھی مگر مجھے یہی حیرت تھی کہ اس پہاڑ میں سب سے زیادہ جسمانی عیب تھے۔ ایک شخص کو دیکھتا ہوں کہ اُس کی پیٹھ پر بھاری سے بھاری اور بڑے سے بڑا بوجھ ہے، مگر خوشی خوشی اُٹھائے چلا آتا ہے۔ جب پاس آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک کُبڑا ہے اور آدم زاد کے انبارِ رنج والم میں اپنے کُبڑے پن کو پھینکنے آیا ہے کہ اُس کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی مُصیبت نہیں۔ اس انبار میں انواع واقسام کے سُقم اور امراض بھی تھے جن میں بعض اصلی تھے اور بعض ایسے تھے کہ غلط فہمیوں نے خواہ مخواہ اُنھیں مرض سمجھ لیا تھا۔ ایک بوجھ مجھے اور نظر آیا جو امراض آدم زاد پر عارض ہوتے ہیں اُن سب کا مجموعہ تھا۔ یعنی بہت سے حسین نوجوان تھے کہ اپنے ہاتھوں کی کمائی یعنی امراض نوجوانی ہاتھوں میں لیے آتے تھے، مگر میں فقط ایک ہی بات میں حیران تھا، اور وہ یہ تھی کہ اتنے بڑے انبار میں کوئی بے وقوفی یا بد اطواری پڑی ہوئی نہ دکھائی دی۔ میں یہ تماشے دیکھتا تھا اور دل میں یہ کہتا تھا کہ اگر ہوس ہائے نفسانی اور ضُعفِ جسمانی اور عیوبِ عقلی سے کوئی نجات پانی چاہے تو اس سے بہتر موقع نہ ہاتھ آئے گا۔ کاش! کہ جلد آئے اور پھینک جائے۔ اتنے میں ایک عیاّش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اُٹھائے بے پروا چلا آتا ہے۔ اُس نے بھی ایک گٹھری پھینک دی مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی عاقبت اندیشی کو پھینک گیا۔ ساتھ ہی ایک چھٹے ہوئے شہدے آئے۔ میں سمجھا کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکیں گے مگر وہ بجائے اس کے اپنی شرم وحیا کو پھینک گئے۔

جب تمام بنی آدم اپنے اپنے بوجھوں کا وبال سر سے اُتار چکے تو میاں وہم کہ جب سے اب تک اس مصروفیت میں سرگرداں تھے، مجھے الگ کھڑا دیکھ کر سمجھے کہ یہ شخص خالی ہے۔ چنانچہ اس خیال سے میری طرف جھکے۔ اُن کو اپنی طرف آتے دیکھ کر

© NCERT not to be republished

میرے حواس اُڑ گئے مگر اُنھوں نے جھٹ اپنا آئینہ سامنے کیا۔ مجھے اپنا منہ اُس میں ایسا چھوٹا معلوم ہوا کہ جی بے زار ہوگیا اور ایسا گھبرایا کہ چہرے کو نقاب کی طرح اُتار کر پھینک دیا اور خاص خوش نصیبی اس بات کو سمجھا کہ ایک شخص نے اپنے چہرے کو بڑا اور اپنے بدن پر ناموزوں سمجھ کر اُتار پھینکا تھا۔ یہ چہرہ حقیقت میں بہت بڑا تھا۔ یہاں تک کہ فقط اُس کی ناک میرے سارے چہرے کے برابر تھی۔

ہم اس انبوہِ آفات پر غور سے نظر کر رہے تھے اور اس عالم ہیولانی کی ایک ایک بات کو تاک تاک کر دیکھ رہے تھے جو سُلطان الافلاک کی بارگاہ سے حُکم پہنچا کہ اب سب کو اختیار ہے جس طرح چاہیں اپنے اپنے رنج و تکلیف تبدیل کرلیں اور اپنے اپنے بوجھ لے کر گھروں کو چلے جائیں۔ یہ سُنتے ہی میاں وہم پھر مستعد ہوئے اور پھر بڑی تُرت پھرت کے ساتھ اس انبارِ عظیم کے بوجھ باندھ باندھ کر تقسیم کرنے لگے۔ ہر شخص اپنا اپنا بوجھ سنبھالنے لگا اور اس طرح کی ریل پیل اور دھکم دھکّا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں وہ بیان کرتا ہوں۔

ایک پیر مرد کہ نہایت معزّز و محترم معلوم ہوتا تھا دردِ قولنج سے جاں بلب تھا اور لاولدی کے سبب سے اپنے مال واملاک کے لیے ایک وارث چاہتا تھا۔ اُس نے دردِ مذکور کو پھینک کر ایک خوب صورت نوجوان لڑکے کو لیا۔ مگر لڑکے نابکار کو نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دِق ہوکر اُس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اُس نالائق نوجوان نے آتے ہی جھٹ بُڈّھے کی داڑھی پکڑ لی اور سر توڑنے کو تیاّر رہوا۔ اتّفاقاً برابر ہی لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا کہ اب وہ دردِ قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا۔ چنانچہ بڈّھے نے اُس سے کہا کہ برائے خُدا میرا دردِ قولنج مجھے پھیر دیجیے اور اپنا لڑکا لے لیجیے کہ میرا پہلا عذاب اس سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ یہ مبادلہ اب پھر نہ ہوسکتا تھا۔

ایک بے چارہ جہازی غُلام تھا کہ اُس نے قیدِ زنجیر اور جہازی محنت کی تکلیف سے دِق ہوکر اس عذاب کو چھوڑا تھا اور جھوٗلے کے مرض کو لے لیا تھا۔ اُسے دیکھا کہ دو قدم چل کر بیٹھ گیا اور سر پکڑے بسور رہا تھا۔

غرض اسی طرح کئی شخص تھے کہ اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے اور اپنے کیے پر پچھتا رہے تھے۔ مثلاً کسی بیمار نے افلاس لیا تھا اور وہ اس سے ناراض تھا۔ کسی کو بھوک نہ لگتی تھی، اب وہ جوع البقر کے مارے پیٹ کو پیٹ رہا تھا۔ ایک شخص نے فکر سے دق ہوکر اُسے چھوڑا تھا۔ اب وہ دردِ جگر کا مارا لوٹ رہا تھا اور اس طرح برعکس غرض ہر شخص کو دیکھ کر عبرت اور پشیمانی ہی حاصل ہوتی تھی۔

عورتیں اپنی ادل بدل کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ کسی نے سفید بالوں کو چھوڑا تھا مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہوگیا تھا کہ لنگڑاتی تھی اور ہائے !ہائے! کرتی چلی جاتی تھی۔ کسی کی پہلے کمر بہت پتلی تھی مگر چوں کہ سینہ اور بازو بھی دُبلے تھے، اس لیے پتلی

© NCERT not to be republished

کمر کو چھوڑا تھا۔ اب گول گول بازوؤں کے ساتھ بڑی سی توند نکالے چلی جاتی تھی۔ کسی نے چہرے کی خوب صورتی لی تھی، مگر اس کے ساتھ بے آبروئی کا داغ اور بدنامی کا ٹیکا بھی چلا آیا تھا۔ غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جسے پہلے نقص کی بہ نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہورہا ہو۔ ان سب کی حالتوں کو دیکھ کر یہ میری سمجھ میں آیا کہ جو مُصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں وہ حقیقت میں ہمارے سہار نے بموجب ہوتی ہیں یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں اُن کی عادت ہوجاتی ہے۔

مجھے اُس بڈّھے کے حال پر نہایت افسوس آیا کہ ایک خوب صورت سجیلا جوان بن کر چلا مگر مثانے میں ایک پتھری پیدا ہوگئی تھی کہ اب بھی سیدھی طرح نہ چل سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اس نوجوان کے حال پر افسوس آتا تھا کہ بچارا لکڑی ٹیکتا گرتا پڑتا چلا جاتا تھا۔ کمر جھکی ہوئی، گردن بیٹھی ہوئی تھی، کھوے سر سے اونچے نکل آئے تھے اور جو عورتیں پہلے اس کی سج دھج پر جان دیتی تھیں اُن کا غول گرد تھا یہ اُنھیں دیکھتا تھا اور پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ جب سب کے مبادلے بیان کیے ہیں تو اپنے مبادلے سے بھی مجھے صاف صاف نہ گزرنا چاہیے۔ چنانچہ اس کی صورت حال یہ ہے کہ بڑے چہرے والے یار میرے چھوٹے چہرے کو لے کر ایسے بدنُما معلوم ہونے لگے کہ جب میں نے اُن کی طرف دیکھا تو اگرچہ میرا ہی چہرہ تھا مگر ایسا بے اختیار ہنسا کہ میری اپنی بھی صورت بگڑ گئی اور صاف معلوم ہوا کہ وہ بچارا میرے ہنسنے سے شرما گیا مگر مجھے بھی اپنے حال پر کچھ فخر کی جگہ نہ تھی۔ کیوں کہ جب میں اپنی پیشانی سے عرقِ ندامت پونچھنے لگا تو وہاں تک ہاتھ نہ پہنچ سکا۔ چہرہ اتنا بڑا ہوگیا تھا کہ ہاتھ رکھتا کہیں تھا اور جا پڑتا کہیں تھا۔ ناک اتنی بڑی ہوگئی تھی کہ جب چہرے پر ہاتھ پھیرا تو کئی دفعہ ہاتھ نے ناک سے ٹکّر کھائی۔ میرے پاس ہی دو آدمی اور بھی تھے جن کے حال پر تمسخر کرنا واجب تھا، ایک تو وہ شخص تھا کہ پہلے ٹانگوں کے مُٹاپے کے سبب سے چھدرا کر چلتا تھا اُس نے ایک لم ٹنگو سے مبادلہ کرلیا تھا کہ جس میں پنڈلی معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ ان دونوں کو جو دیکھتا تھا، وہ ہنستا تھا۔ ایک تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دو بلّیوں پر چلا جاتا تھا۔ سر کا یہ عالم تھا گویا ہوا میں اُڑا جاتا ہے اور دوسرے کا یہ حال تھا کہ چل ہی نہ سکتا تھا۔ کمالِ کوشش سے قدم اُٹھاتا تھا مگر یہ حال تھا کہ دونوں طرف دو دائرے کھنچے چلے جاتے تھے۔ میں نے اس عجیب الخلقت کی حالتِ غریب کو دیکھ کر کہا کہ میاں! اگر دس قدم سیدھے چلے جاؤ تو سودَمڑی کی ریوڑیاں کھلاتے ہیں۔

غرض وہ سارا اَنبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہوگیا مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا یعنی ان سے بے زار تھے اور اپنے اپنے بوجھوں میں دبے ہوئے اوپر تلے دوڑتے پھرتے تھے۔ سارا میدان گریہ وزاری، نالہ وفریاد، آہِ افسوس سے دُھواں دھار ہورہا تھا۔ آخر میں سُلطان الافلاک کو بے کس آدم زاد کے حالِ دردناک پر رحم آیا اور حُکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اُتار کر پھینک دیں، پہلے ہی بوجھ اُنھیں مل جائیں۔ سب نے خوشی خوشی اُن وبالوں کو سر وگردن سے اُتار کر پھینک دیا۔ اتنے میں دوسرا حُکم

آیا کہ وہم جس نے اُنھیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا وہ شیطان نابکار یہاں سے دفع ہو جائے۔ اُس کی جگہ ایک فرشتۂ رحمت آسمان سے نازل ہوا۔ اُس کی حرکات وسکنات نہایت معقول و باوقار تھیں۔ اور چہرہ بھی سنجیدہ اور خوش نما تھا۔ اُس نے بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اُٹھایا اور رحمتِ الٰہی پر توکّل کر کے نگاہ کو اُسی کی آس پر لگا دیا۔ اُس کا نام صبر وتحمّل تھا۔ ابھی وہ اس کوہِ مُصیبت کے پاس آکر بیٹھا ہی تھا کہ کوہِ مذکور خود بہ خود سمٹنا شروع ہوا، یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے ایک ثُلث رہ گیا۔ پھر اُس نے ہر شخص کو اصلی اور واجبی بوجھ اُٹھا کر دینا شروع کیا اور ایک ایک کو سمجھا تا گیا کہ نہ گھبراؤ اور بُردباری کے ساتھ اُٹھاؤ۔ ہر شخص لیتا تھا اور اپنے گھر کو راضی رضا مند چلا جاتا تھا۔ ساتھ ہی اُس کا شکریہ ادا کرتا تھا کہ آپ کی عنایت سے مجھے اس انبارِ لاانتہا میں سے اپنا بارِ مُصیبت چُننا نہ پڑا۔

(محمد حسین آزاد)

مشق

سوالات

1۔ سُلطانِ افلاک کے دربار سے کیا اشتہار جاری ہوا؟

2۔ وہم کا کیا حُلیہ بتایا گیا ہے تفصیل سے لکھیے؟

3۔ لوگ اپنی پہلی مصیبت سے چھُٹکارا کیوں پانا چاہتے تھے؟

4۔ مصیبتوں کو بدلنے کے بعد لوگوں نے خود کو کیسا محسوس کیا؟

5۔ اپنی اپنی مصیبتوں کو بدلنے کے بعد بھی لوگوں کی پریشانیاں کم کیوں نہیں ہوئیں؟

6۔ صبر وتحمّل کا بیان کس طرح کیا گیا ہے؟

© NCERT not to be republished

خاکہ

لفظ ''خاکہ'' انگریزی لفظ اسکیچ (Sketch) کا ترجمہ ہے۔ خاکے میں جس شخص کی تصویر کشی کی جاتی ہے اس کے خیالات وافکار، سیرت وکردار، عادات واطوار سب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ خاکہ میں متعلقہ شخص کے نمایاں اوصاف بیان کیے جاتے ہیں۔ خاکہ لکھنے والے کا متعلقہ شخص سے واقف ہونا ضروری ہے۔ خاکہ نگاری سوانح نگاری سے مختلف ہے۔ اس میں سوانح حیات کی طرح واقعات ترتیب وار نہیں لکھے جاتے اور نہ ہی تمام حالات وواقعات کا بیان کرنا ضروری ہے۔ خاکہ نگاری میں اُن حالات و واقعات کا بیان ضمنی طور پر کیا جاتا ہے جو شخصیت کے کسی پہلو کو اُجاگر کرتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ خاکے میں شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو غیر جانب داری کے ساتھ بیان کیا جائے۔

© NCERT not to be republished

چچی

5287CH08

وہ جگت چچی تو نہیں تھیں لیکن محلّے کے جن دو چار گھروں میں وہ چچی کہلاتی تھیں ان میں ایک گھر ہمارا بھی تھا۔ چچی کا نام فصیح اردو میں تو محمد النساءؑ تھا لیکن خود وہ اپنا نام روانی میں ممّن نساں بتاتی تھیں۔ پڑھنے کے نام پر انھیں سوائے نماز کے اور کچھ نہ آتا تھا۔ ہاں سینے پرونے میں انھیں وہ کمال حاصل تھا کہ اپنی سوئی کی نوک سے وہ کپڑے پر خطِّ گلزار کے وہ نمونے پیش کر دیا کرتی تھیں جو بڑے بڑے خطّاط اور خوش نویس قلم کے قط سے نہیں کر سکتے۔ چچی نے لگ بھگ اسّی برس کی عمر پائی۔ زندگی کی آدھی صدی انھوں نے ۱۹۴۷ سے پہلے کی دلّی میں گزاری اور آدھی سے کچھ کم سینتالیس کے بعد کی دلّی میں۔ چچی ان لوگوں میں تھیں جو اپنے زمانے کے علاوہ کسی اور زمانے میں نہ تو جینا پسند کرتے ہیں اور نہ ہی جی سکتے ہیں۔ اس لیے چچی نے بھی سینتالیس کے بعد اپنی زندگی کے پینتیس چالیس سال پرانی دلّی کے اُن ہی محلوں میں گزار دیے جہاں وقت بالکل اُسی طرح ٹھہرا ہوا ہے جس طرح سیلاب کے گزر جانے کے بعد سیلاب کا کچھ پانی آس پاس کے گڑھوں میں ٹھہرا رہ جاتا ہے۔ سینتالیس سے پہلے جب دلّی کی عورتیں تانگوں میں بیٹھ کر اور ان کے گِرد موٹے موٹے پردے لپیٹ کر کوٹلے، نظام الدّین، ہمایوں کے مقبرے، منصور کے مدرسے اور قطب صاحب کی سیر کو جاتی تھیں اور اولیا مسجد کے جھروکوں سے شمسی تالاب کا وہ نظارہ دیکھتی تھیں جہاں تالاب کے بیچوں بیچ مٹکوں پر بیٹھا کوئی آدمی سنگھاڑوں کی بیل سے سنگھاڑے توڑ توڑ کر جمع کر رہا ہوتا تھا تو چچی بھی اُن عورتوں میں ہوتی تھیں۔ لیکن سینتالیس کے بعد تو چچی بس ایک ہی بار فصیل کے باہر آئیں اور وہ بھی تب جب ہم انھیں دلّی دروازے کے باہر پہنچانے گئے تھے۔

معصوم قسم کی مذہبیت، پرانے رسم و رواج، تعویذ گنڈے، ٹونے ٹوٹکے، بدعتیں اور توہمات، چھلاوے، پریوں اور جنّات کے قصے، یہی وہ فضا تھی جس میں چچی پیدا ہوئیں اور زندگی بھر وہ اسی فضا میں سانس لیتی رہیں۔

ہم نے جب ہوش سنبھالا، چچی کو رانڈ ہی دیکھا۔ لیکن انھوں نے اپنا رنڈاپا جس کروّفر سے گزارا اسے دیکھ کر سوچنا پڑتا ہے کہ اگر کہیں ان کی جگہ ان کے میاں رنڈوے ہو گئے ہوتے تو شاید ایسی نہ گزار پاتے جیسی چچی گزار گئیں۔ چچی کے میاں اُن کی جان پہ چار لڑکیوں کو چھوڑ کر سینتالیس سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ جب تک اللہ بخشے وہ زندہ رہے، چچی کو خوب عیش

کرایا۔ کچہری میں منشی تھے اس لیے اس چھوٹی سی نوکری میں بھی پیسے کی خوب ریل پیل تھی۔ چچی کہا کرتی تھیں، 'بوا کوئی کیا کسی کے نخرے اٹھائے گا جو ہمارے میاں نخرے اٹھا گئے'۔ لیکن چچی کا جو طُمطراق ہم نے دیکھا ہے، اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ نخرے چچی کے میاں نے شاید اتنے نہیں اٹھائے جتنے خود چچی نے ان سے اٹھوائے ہوں گے۔ پٹاری کے خرچے کے علاوہ اچھے سے اچھا کھانے اور بڑھیا سے بڑھیا پہننے کا شوق بھی چچی نے میاں کے جیتے جی، جی کھول کر پورا کیا۔ کچہری کی آمدنی برسات کے پانی کی طرح جیسے گھر میں چھم چھم برستی تھی ویسے ہی جھر جھر بہہ بھی جاتی تھی۔ اس لیے جب اچانک چچی کے میاں کا انتقال ہوا تو گھر میں چار معصوم بچّوں کے علاوہ باقی اللہ کا نام تھا۔ چچی کے پاس نہ تعلیم تھی اور نہ روپیا پیسا لیکن مفلس اور ان پڑھ لوگ جس عقیدے کے سہارے کڑی سے کڑی جھیل جاتے ہیں، وہ ان کے پاس بھی تھا یعنی یہ کہ جو لکھا ہے وہ پورا ہونا ہے۔ چچی شاید لوحِ محفوظ کی حقیقت سے تو واقف نہیں تھیں لیکن یہ فقرہ البتہ ان کی گفتگو میں تکیۂ کلام کا سا درجہ رکھتا تھا کہ 'بوا لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا'، چچی نے بھی لکھے کو مٹانے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے لکھے کے آگے سر جھکا کر ہی اپنی ساری زندگی گزاری۔

جب تک سہاگن رہیں طرح طرح کے جوڑے خود اپنے ہاتھ سے ٹانک کر پہنتی تھیں۔ اب یہی مہارت ان کی زندگی کا سہارا تھی۔ ہاتھ کی تُرپائی کے مقابلے میں 'موئی سنگر مشین' کی حیثیت چچی کے نزدیک وہی تھی جو اکبر بادشاہ کے نزدیک خطاطی کے مقابلے میں چھاپے خانے کی تھی۔ چچی اگرچہ انسان کے چاند پر پہنچنے کے بھی دس برس بعد اللہ کو پیاری ہوئیں لیکن سلائی مشین کے ہینڈل کو ان کا ہاتھ مرتے دم تک چھو کر نہیں گزرا۔ وہ سلائی کا باریک سے باریک کام بڑی مہارت سے کرتی تھیں۔ ان کے کام میں لاگت برائے نام اور محنت اور کاریگری پوری ہوتی تھی۔ کپڑے کی رنگ برنگی کترنوں کو جمع کر کے جو ادھر ادھر سے مفت مل جاتی تھیں وہ سلائی کے کُرتوں، ساڑیوں اور دوپٹوں پر کیکری کٹاؤ کا بہترین کام بنا دیا کرتی تھیں۔ چوں کہ اس کام کے کرنے والے بہت کم رہ گئے تھے اس لیے چچی کے پاس کام کی کمی نہیں تھی۔ تاہم اس کام سے ان کا بمشکل ہی گزارا ہوتا تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف تو وہ اپنے کام کی اجرت گاہک کی حیثیت کو دیکھ کرنہیں بلکہ اپنی حیثیت کو دیکھ کر طلب کرتی تھیں۔ چچی نے اسی قلیل آمدنی میں اپنی چار لڑکیوں کی شادیاں کر ڈالیں اور دنیاداری کے معاملات کو بھی سلیقے کے ساتھ پورا کیا۔

چچی میں خدمتِ خلق کا بے پناہ جذبہ تھا۔ ہر ایک کے دکھ سکھ میں ہمیشہ شریک رہتی تھیں۔ اسی لیے پرانی بڑی بوڑھیوں کی طرح انھیں ہر ایک کی سُن گُن لینے کی عادت تھی۔ آپ کوئی بات چچی کو بتانا چاہیں یا نہ چاہیں لیکن اُن سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی تھی۔

چچی جس مکان میں رہتی تھیں اس میں کُنبے کے کئی گھر آباد تھے۔ دن بدن اس گھر کی آبادی بڑھتی جارہی تھی جس سے چچی کے لیے جگہ تنگ ہوتی جارہی تھی۔ چچی کی بیٹیاں ان کو جتنا مانتی تھیں اتنا نواسیاں نواسے نہیں مانتے تھے اور جب نواسیوں کے بھی بچّے ہونے لگے تو ان کے لیے تو چچی کی حیثیت ایک آثارِ قدیمہ کی سی تھی۔ ایک طرف عمر کے ساتھ مزاج بے ٹھکانے ہوتا جارہا تھا اور دوسری طرف نئی پود نے چچی کے ساتھ ہر وقت چھیڑ خانی مچا رکھی تھی جس سے چچی اکثر ان سے ناراض ہوجایا کرتی تھیں۔ ایسے میں ہمارے گھر میں آکر کہا کرتی تھیں ’بوا آج کل میں گھر میں سب سے ناراض ہوں‘، پھر دوسرے ہی سانس میں یہ بھی بتاتی تھیں کہ ’کسو کو پتا تھوڑی ہے کہ میں ناراض ہوں‘۔

چچی کبھی کبھی بڑے مزے کی باتیں کرتی تھیں۔ ہسپتال سے، جسے وہ اسپتال کہتی تھیں، بڑا ڈرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ کسی کو ہسپتال بھیجنے کا مطلب اسے جیتے جی قبرستان بھیجنا ہے۔ چچی کے ایک داماد کسی موذی مرض کا شکار ہوکر ہسپتال میں داخل ہوئے اور دو مہینے بعد اچھے ہوکر گھر لوٹے لیکن چچی کا تاثر یہ تھا کہ ’بوا جب اسپتال میں بھرتی ہوا تھا تو خاصا ہٹّا کٹّا تھا، مُردوں نے ادھ مرا کر کے نکالا ہے، نگوڑے کے بدن سے سارا خون کھینچ لیا‘۔

سائنس کی نئی نئی ایجادات نے جیسے نظامِ فطرت کا توازن بگاڑ کر رکھ دیا ہے ویسے ہی چچی کے اعصاب کو بھی متاثر کر دیا ہے۔ بس اور موٹر کی گھُوں گھُوں سے چچی کو چکّر آتے تھے اس لیے وہ ان سواریوں میں کبھی نہیں بیٹھتی تھیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ ریل میں بھی کبھی بیٹھی تھیں یا نہیں۔ ایک بار کسی بہانے گھر والے انھیں بائیسکوپ لے گئے۔ اُس بند اور تاریک منڈوے میں ان کا ایسا دم گھٹا کہ انھوں نے منڈوے کی بتّیاں بجھتے ہی چلو چلو مچادی اور ان کے ساتھ سب کو ویسے ہی واپس آنا پڑا۔ ’ریڈوے کی دھائیں دھائیں سے تو ان کا ویسے ہی سر چکراتا تھا اب یہ نئی آفت موئی ’ٹیلی وِجَن‘ کی شروع ہوئی تھی۔ اِدھر شام کو گھر میں ٹیلی وژن کھلا اور اُدھر چچی نے اپنا برقع اٹھا کسی ایسے گھر کا رخ کیا جہاں ٹیلی وژن نہیں تھا۔

چچی کی والدہ کا انتقال خود چچی کے انتقال سے کوئی سات یا آٹھ برس پہلے ہی ہوا تھا۔ ان کی امّاں نے کوئی سو سے اوپر

© NCERT not to be republished

عمر پائی تھی۔ جیسا کہ اتنی عمر کے لوگوں کا حال ہوتا ہے۔ بے چاری بڑی بی بالکل حواس باختہ اور معذور، بس کھٹولے پر ہی پڑے پڑے دنیا کے کاموں سے فراغت پاتی تھیں۔ چچی دل سے چاہتی تھیں کہ اللہ ان کی امّاں کا پردہ ڈھک لے مگر چچی کے نواسے نواسیوں کا خیال تھا کہ بڑی بی تو قیامت کے بوریے سمیٹ کر جائیں گی۔ انھوں نے تو قیامت کے بوریے نہیں سمیٹے لیکن جب تک وہ زندہ رہیں ان کی صفائی ستھرائی کے رستے چچی ضرور جنت کی جھاڑو دیتی رہیں۔ جب کبھی ہم چچی سے ان کی امّاں کی خیر صلاّ، خیر عافیت پوچھتے تو وہ ان کی حواس باختگی کا ذکر اپنی بھولی بھالی زبان میں یوں کرتیں: 'وِن کے خیالات خراب ہوگئے ہیں، بہکی بہکی باتیں کرتی ہیں۔'

چچی نے بیوہ اور بے سہارا ہونے کے بعد اپنے تمام تر دقیانوسی پن کے باوجود حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا سیکھ لیا تھا۔ وہ سیّدانی تھیں اور اس زمانے کی سیّدانی جب بیاہ شادی کے معاملوں میں لڑکی دیتے ہوئے اس بات کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ لیکن جب چچی نے اپنی لڑکیوں کی شادیاں کیں تو ان کے سامنے تو ایک ہی بات تھی اور وہ یہ کہ رانڈ ماں کی جوان بچیاں جتنے جلدی اپنے گھر کی ہو جائیں اچھا ہے۔ انھوں نے سیدزادوں کے انتظار میں اپنی لڑکیوں کو چھاتی پہ نہیں بٹھائے رکھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کے چاروں دامادوں میں سے کوئی سیدزادہ ہے یا نہیں۔

چچی کو وہ مرد بڑے عجیب لگتے تھے جو گھر کے کام کاج میں حصہ لیتے ہیں۔ مجھے باورچی خانے میں گھسنے کا کچھ زیادہ ہی مرض ہے۔ اگر ایسے موقعے پر کبھی چچی آدھمکتیں تو فوراً میری بیوی سے کہتیں، 'اچھا بوا تو آج یہ پکارہے ہیں' اس بات کا سلیس اُردو میں یہ مطلب ہوتا تھا' ڈوب مرو خصم سے کھانا پکوارہی ہو۔' لہٰذا مجھے بیوی کی طرف سے یہ ہدایت تھی کہ اگر میں باورچی خانے میں ہوں اور چچی آتی دکھائی دے جائیں تو فوراً ہنڈیا چھوڑ چھاڑ جا کر اپنے لکھنے پڑھنے میں لگ جاؤں۔ مجھے گھر میں کام کرتا دیکھ کر چچی کہتی تھیں، ''بوا! تمھارے میاں تو خاصا ہاتھ بٹا دیتے ہیں، ہمارے دامادوں میں سے تو کوئی ہل کے پانی بھی نہیں پیتا۔''

چچی ہمارے گھر کتنے ہی مختصر دورے پر کیوں نہ آئیں لیکن چاق و چوبند پریس رپورٹر کی طرح وہ جلدی جلدی اپنی تمام تفتیش مکمّل کرلیا کرتی تھیں۔ ایک بار میں گھر پر اکیلا تھا۔ یونیورسٹی کی کچھ خواتین کسی سلسلے میں میرے گھر آئیں، کچھ ہی دیر میں پیچھے پیچھے چچی بھی آ گئیں۔ انھیں ذرا جلدی تھی اس لیے بس کھڑے کھڑے کو آئی تھیں۔ چچی نے آتے ہی ان اپٹوڈیٹ خواتین کو دیکھا پھر میری طرف دیکھا، پھر ان سے مخاطب ہوئیں اور بولیں، 'اچھا تو بوا تم دلہن سے ملنے آئی ہوگی۔' میں نے کہا'' چچی نہیں یہ تو مجھ سے ملنے آئی ہیں۔'' چچی یہ سنتے ہی برقع ایک طرف رکھ، پھسکڑا مار کے بیٹھ گئیں اور لگیں ان خواتین سے طرح طرح کی باتیں کرنے۔ کچھ ہی دیر میں میری بیوی بھی آ گئیں۔ اب ذرا چچی کی جان میں جان آئی اور انھیں یہ بھی یاد آیا کہ 'اے ہے میں تو کھڑے

© NCERT not to be republished

کھڑے کو آئی تھی۔‘ یہ بات چچی کی سمجھ میں بہت دن تک نہیں آئی کہ عورتیں بجائے میری بیوی کے مجھ سے ملنے کیوں آئی تھیں اور اگر آئی بھی تھیں تو میری بیوی نے اس کا فضیحتا کیوں نہیں کیا۔

آخری دنوں میں جب آنکھوں اور ہاتھ پیروں سے مجبور ہوگئی تھیں اور ان سے کام بھی زیادہ نہیں ہوتا تھا تو ان کا وقت زیادہ تر اپنے قدردانوں کے گھروں میں گزرتا تھا۔ وہ سلوک کی توقع میں وہاں جاتی تھیں مگر اپنے منہ سے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ ایسے موقعے پر وہ بڑی ہانپتی کانپتی دروازے میں داخل ہوتی تھیں، لگتا تھا اب گریں۔ لوگ انھیں سہارا دے کر بٹھاتے۔ تھوڑی دیر میں ان کے حواس بجا ہونے شروع ہوتے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھلی چنگی ہوجاتیں اور پھر آگے کے معاملات یوں چلتے:

’’چچی چا پئیں گی؟‘‘

’’بوا تم پی رہی ہو تو ذری سی مجھے بھی بنا دو۔‘‘

’’چچی کھانا کھائیں گی؟‘‘

’’لاؤ کہتی ہو تو کھا لیتی ہوں، کیا پکایا ہے؟‘‘

’’اروی کا سالن۔‘‘

’’دے دو ذرا سا- نیبو اور گرم مسالہ بھی ہے؟‘‘

اب چچی کے سامنے کشتی میں کھانا لگا ہوا ہے۔ چچی کھاتی جارہی ہیں اور کھانے پر بے لاگ بتصرہ کرتی جارہی ہیں۔

’اے بُوا چپاتی کے کنارے ذرا سے کچے رہ گئے...... کنارے چھوڑنا رزق کی بے ادبی...... دیکھنا سالن میں نمک پھیکا رہ گیا۔‘ اب اگر آپ انھیں پسا ہوا نمک پیش کریں تو کہیں گی، ’اے بوا پکے ہوئے نمک کا اور مزا ہوتا ہے، کچا نمک ڈالنے میں وہ بات تھوڑی آتی ہے۔‘ چچی کو پانی پلانا بھی اپنے آپ کو مشکل میں ڈالنا ہوتا تھا۔ پہلا گھونٹ لیتے ہی کہتی تھیں، ’اے کیا صراحی تازی بھری ہے؟ بالکل گرم پانی ہے۔‘

عمر کے ساتھ ساتھ چچی کا ہاضمہ بھی جواب دے چکا تھا لیکن زبان کا چٹخارا پھیکے سیٹھے کھانوں کو قبول نہیں کرتا تھا۔ اس لیے آئے دن انھیں بقائی کی دو نمبر خوراک پینی پڑتی تھی۔ بقائی کی دو نمبر خوراک کا بھی اپنا مزا ہے۔ پیٹ کی تکلیف کی اتنی مزے دار دوا ہمیں سب سے پہلے چچی نے ہی بتائی تھی۔ ایک دفعہ کسی دعوت میں سے پیٹ پکڑے پکڑے ہمارے گھر آئیں۔ میری بیوی نے کہا، ’چچی پھر کچھ الٹا سیدھا کھا لیا کیا؟‘ کہنے لگیں، ’بوا تم جانو بندہ بشر ہے سب کو کھاتا دیکھ کر ذری سی لال روٹی کا ٹکڑا اور دونوالے چانولوں کے میں نے بھی کھا لیے، ایسا کون سا غضب ہوگیا۔ تم جانو سداں اچھا کھایا۔‘ ان کی حالت یہ تھی کہ روکھا پھیکا کھایا نہیں

© NCERT not to be republished

جاتا تھا اور قورمہ بریانی پچتا نہیں تھا۔

آخری دنوں میں جب چچی کی آنکھیں جواب دے گئیں اور ان کی نظروں سے سوائے دھند کے دنیا کی ہر چیز اوجھل ہوگئی تو انھوں نے برقعے کو بھی کھونٹی پہ ٹانگ دیا۔ شاید وہ یہ سمجھنے لگی تھیں کہ جس طرح ان کی آنکھوں سے دنیا اوجھل ہوگئی تھی، اسی طرح دنیا کی آنکھوں سے وہ خود بھی اوجھل ہوگئی ہیں۔ ویسے وہ کہا کرتی تھیں، 'بوا پردہ کیا بس ذری سی آنکھ کی شرم ہے۔ اب جب آنکھیں ہی پٹم ہوگئیں تو پردہ کا ہے کا۔'

چچی اپنی ضعیف العمری کے ساتھ ساتھ موت سے بہت ڈرنے لگی تھیں اور اس کے ساتھ ہی قبر کی کالی کوٹھری کے تصور سے بھی۔ سب ان کو دلاسا دیتے رہتے تھے کہ چچی ابھی آپ مرنے والی نہیں ہیں۔ آپ کی امّاں کو مرے کے برس ہوئے ہیں جو آپ مرنے کی باتیں کرتی ہیں۔ ان باتوں سے بھولی بھالی چچی کے دل سے شاید کچھ دیر کے لیے موت کا ڈر دور ہوجاتا پھر وہ کہنے لگتی تھیں، 'بوا دعا کرو آنکھوں میں ذری سی روشنی آجائے تو پھر کچھ ہاتھ پیر ہلانے شروع کروں۔ یہ موئی مُج مُج کی محتاجی سے تو میرا جی بولا گیا۔' اور یہی کہتے کہتے ایک دن چچی چپ چاپ اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کے عزیزوں نے ان کے ہاتھوں میں پڑی سونے کی دو چوڑیوں اور کانوں کی بالیوں سے اُن کا کفن دفن کیا اور دلّی دروازے کے باہر نئے قبرستان میں انھیں سپردِ خاک کرآئے۔ جہاں بہت سی گمنام اور جلد ہی بے نشان ہوجانے والی قبروں میں ایک قبر اُن کی بھی ہے۔

(اسلم پرویز)

مشق

سوالات

1۔ بیوہ ہوجانے کے بعد چچی نے اخراجات پورے کرنے کے لیے کیا پیشہ اختیار کیا؟ تفصیل سے لکھیے۔

2۔ مصنف کے گھر میں خواتین کو موجود دیکھ کر چچی کا ردِّعمل کیا تھا؟

3۔ آخری دنوں میں چچی اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کیا تدبیر کرتی تھیں؟

4۔ جب چچی کی بینائی جواب دے گئی تو انھوں نے کیا کہا؟

5۔ چچی کی شخصیت کے چند دلچسپ پہلوؤں پر روشنی ڈالیے۔

© NCERT not to be republished

سفرنامہ

سفرنامہ ادب کی ایک مقبول صنف ہے۔ ہر سفر ایک تجربہ ہوتا ہے اور اگر کسی شخص میں اس تجربے کو بیان کرنے کی صلاحیت بھی ہو تو ایک دل چسپ سفرنامہ لکھا جاسکتا ہے۔ پرانے زمانے میں جب مسافر سفر سے واپس آتے تو اپنے تجربات کی روداد دوستوں اور عزیزوں کو سناتے تھے۔ اس طرح کے بہت سے قصّے آپ نے بھی پڑھے ہوں گے۔ سفرنامے کے مطالعے سے اجنبی دیاروں، دوردراز کے ملکوں کی تہذیب، تاریخ اور جغرافیہ سے واقفیت ہوجاتی ہے۔ بہت سے انوکھے کرداروں سے متعارف ہوتے ہیں۔ سفرناموں کے مطالعے سے عام معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ گھر بیٹھے بڑی سے بڑی مہم سر ہوجاتی ہیں اور ایسے دیاروں تک جا پہنچنا ممکن ہوجاتا ہے جہاں جانا آسان نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے سفرنامے کو عملاً سفر کا بدل بھی کہا جاسکتا ہے۔

اردو کا پہلا سفرنامہ یوسف خاں کمبل پوش کا ''عجائبات فرنگ'' (1846) ہے۔ یوسف خاں نے 30 مارچ 1837 میں کولکاتا سے پانی کے جہاز کے ذریعے انگلستان کا سفر کیا تھا۔ انھوں نے انگلستان کے شہر لندن میں قیام کیا اور وہاں کی آب و ہوا، نئی نئی ایجادات اور وہاں کے باشندوں کا ذکر نہایت دل چسپ انداز میں کیا ہے۔

بیسویں صدی کے سفرناموں میں منشی محبوب عالم کا ''سفرنامۂ بغداد'' اور قاضی عبدالغفار کا ''نقشِ فرنگ'' بہت مقبول ہوئے۔ خواجہ احمد عباس کا ''مسافر کی ڈائری''، پروفیسر احتشام حسین کا ''ساحل اور سمندر''، قرۃ العین حیدر کا ''جہانِ دیگر'' اردو کے دل چسپ سفرنامے ہیں۔ اردو میں چند مزاحیہ سفرنامے بھی لکھے گئے ہیں جن میں ابن انشا، شفیق الرحمٰن اور مجتبٰی حسین کے سفرنامے قابلِ ذکر ہیں۔

© NCERT not to be republished

صالحہ عابد حسین

(1913–1988)

صالحہ عابد حسین کا اصلی نام مصداق فاطمہ تھا۔ وہ حالؔی خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی پیدائش پانی پت میں ہوئی۔ خواجہ غلام الثّقلین کی صاحبزادی تھیں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق انھیں بچپن ہی سے تھا، مشہور مصنف، فلسفی اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر عابد حسین سے شادی کے بعد ان کے تصنیف و تالیف کے شوق میں مزید اضافہ ہوا۔ وہ بنیادی طور پر ایک ناول نویس اور افسانہ نگار تھیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں، افسانوں اور ڈراموں کے ذریعے انسانی اور تہذیبی قدروں کو عام کیا اور عورتوں کے مسائل اور سماجی خرابیوں کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی۔ حکومتِ ہند نے ان کو ’پدم شری‘ کا اعزاز عطا کیا۔ کئی صوبائی اکادمیوں نے بھی انھیں انعام دیے۔ ان کے ناولوں میں ’عذرا‘، ’آتشِ خاموش‘، ’قطرے سے گہر ہونے تک‘، ’یادوں کے چراغ‘ اور ’اپنی اپنی صلیب‘ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ افسانوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

وہ ایک سفرنامہ نگار کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔

© NCERT not to be republished

دیارِ حبیب

دیارِ حبیب میں حاضری اور حج کی تمنّا ہر مسلمان کے دل کی آرزو ہوتی ہے۔ نہیں جانتی کتنی کم سِنی سے میرے دل میں یہ خواہش پل رہی تھی۔ مگر جب وہاں کے ہجوم اور سفر کی کٹھنائیوں کا تذکرہ سنتی تو سوچا کرتی کہ میں حج کے بجائے عمرہ کروں گی۔ (مجھے حج اور عمرہ کے ارکان کا فرق بھی معلوم نہ تھا۔ صرف زمانے کا فرق سمجھتی تھی۔) جب بھابی جان 1960 یا 1961 میں حج کے لیے گئیں تو اور زیادہ شدّت سے اپنی محرومی کا احساس ہوا۔ جب 1962 میں چھوٹے بھائی جان کے ساتھ 'زیارت' کے لیے گئی تب میں نے ان سے کہا کہ ساتھ ساتھ مدینہ منوّرہ اور مکّہ معظّمہ کی بھی زیارت کرلیں۔ مگر یہ ممکن نہ ہوسکا اور میں دل مار کر رہ گئی۔ عابد صاحب اکثر میرے منہ سے اس خواہش کو سُنتے مگر خاموش رہتے یا انشاء اللہ کہہ کر تسلّی دیتے مگر جب تک وہاں سے بلاوا نہ آئے کیسے جایا جاسکتا ہے؟ 'لبّیک لبّیک' کہتے ہوئے حاجی یا زائر وہاں جاتا ہے اس کا مطلب ہی یہ ہوا نا کہ پُکارا جارہا ہے اور وہ صدقِ دل سے حاضر ہونے کا اعلان کررہا ہے۔

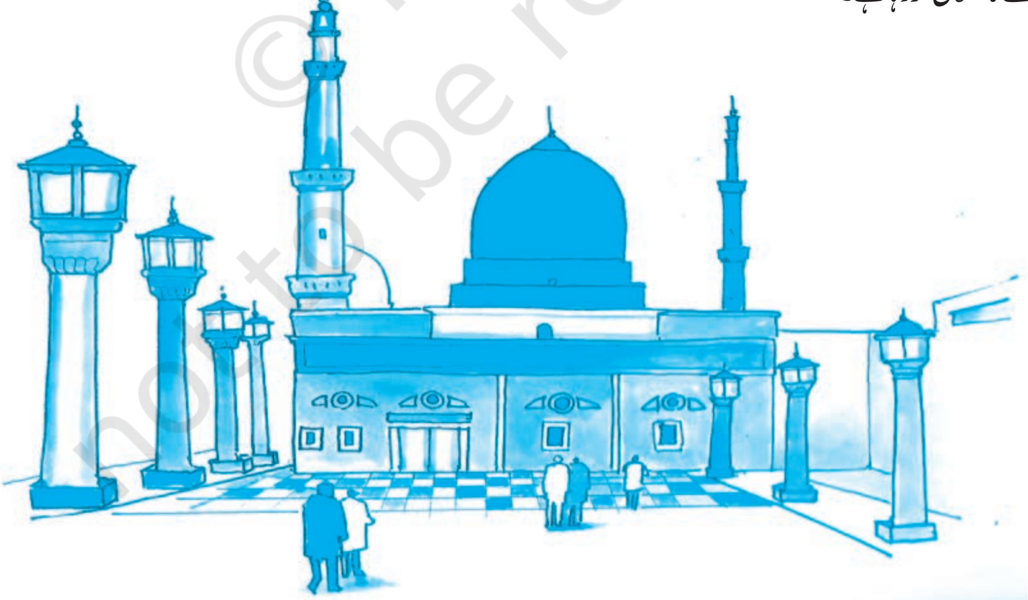

1968 میں عابد صاحب امریکہ، یورپ اور ایشیا کے بہت سے ممالک کا سفر 'اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی ، کے سلسلے میں کرنے گئے تھے۔ واپس آنے کے بعد اکتوبر میں ان کا آپریشن ہوا۔ ان کا ارادہ اس کے بعد ملیشیا اور انڈونیشیا وغیرہ جانے کا بھی تھا۔ ان کی صحت یابی کے بعد میں نے ان سے کہا'' آپ ہر جگہ گئے میں راضی ہوگئی مگر اب آپ مجھے حج کرا کے لائیے کہ حج بغیر محرم کے ہو نہیں سکتا اور میرے دونوں بھائی بیمار ہیں اور مصروف بھی۔ باپ نہیں ، بیٹا نہیں۔ آپ کے سوا کون ہے اور؟''

یہ بات پہلے بھی کہی تھی بارہا مگر کوئی وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت کی گئی خواہش فوراً ہی پوری ہو جاتی ہے۔ عابد صاحب راضی ہوگئے۔

میں اس قدر خوش ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتی۔ یہ بھی خدا کی مہربانی تھی۔ اگر ہم اس سال حج نہ کر پاتے تو پھر ممکن ہی نہ تھا کہ ہم دونوں کی صحت اور حالات پھر اس قابل رہتے۔ جانے سے پہلے میں نے اپنے کئی عزیزوں کو خط لکھے کہ مُجھ سے جو غلطیاں ہوئی ہوں معاف کر دیں۔ جواب باصواب ملے۔ دیگر سب انتظامات بھی آسانی سے ہو گئے۔ تاریخِ سفر طے ہوگئی۔ سیّد ہادی سکندر (مرحوم) جن کی بیوی لکھنؤ کی تھیں، وہ ہندوستان کے اکثر حاجیوں کے وکیل ہوتے تھے۔ لوگوں نے ان کی ہم سے بہت تعریف کی۔ انھیں کو اپنا 'وکیل' مقرر کرایا۔ معلوم ہوا کہ جامعہ ہائر سیکنڈری اسکول کے ہیڈ ماسٹر عبدالحق خان اور ان کی بیوی بھی ہمارے ساتھ ہی بمبئ سے حج کو جا رہی ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ میرے ساتھ کی وجہ سے ان کی بیگم ہوائی سفر وغیرہ سے گھبرائیں گی نہیں۔ دلّی اسٹیشن پر ان کو اور ہم کو رخصت کرنے والوں کا خاصا ہجوم تھا۔ سب سے رخصت ہو کر بخیر و عافیت بمبئ پہنچے۔

اسٹیشن پر باوجود منع کرنے کے بھائی موجود تھے۔ حالاں کہ ان کی طبیعت کچھ دن پہلے بہت خراب رہ چکی تھی مگر ممکن نہ تھا کہ میں بمبئ آؤں اور وہ اسٹیشن یا ہوائی اڈّے پر موجود نہ ہوں۔ بہر حال سامان ان کے سُپرد کیا اور ہم لوگ معین الدین حارث صاحب کے ساتھ حج کمیٹی کے دفتر پہنچے۔ وہاں حارث صاحب اور ایک صاحب کی مدد سے سب کام نسبتاً آسانی سے ہو گئے اور جب ساڑھے تین بجے بھائی کے گھر پہنچے تو وہ انتظار میں بھوکے بیٹھے تھے۔ سامان اپنے کمرے میں رکھوا دیا تھا۔ خاطر داری اور پیار کی برکھا ہو رہی تھی اور مشورے اور اعتراض کی بھی۔ ایک بار یہ بھی کہا کہ عابد صاحب اتنے کمزور اور عمر رسیدہ اور تو ان کو حج کے لیے لے جا رہی ہے! مگر میں نے بگڑ کر جواب دیا'' واہ! وہ تو خود جانے کے لیے بہت keen (پُرشوق) ہیں''۔

ویسے جامعہ میں اور باہر بھی عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ عابد صاحب صرف میری وجہ سے جا رہے ہیں۔ خیر اصرار تو میرا بھی تھا مگر یہ کم لوگ سمجھتے تھے کہ ان کا دلِ نورِ ایمان سے روشن ہے بلکہ مذہب کے ارکان ادا کرنے کی بھی وہ بڑی حد تک کوشش کرتے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کی خدمت تو ان کی زندگی تھی۔

© NCERT not to be republished

ایرپورٹ پر یوں تو سبھی عزیز تھے مگر چھوٹے بھائی جان عادت سے مجبور، محبت سے سرشار مجھے مشورے دے رہے تھے، نصیحت کررہے تھے۔ عابد صاحب پر چُپکے چُپکے فقرے کس رہے تھے۔ ویسے تو میں دو چار دن کو بھی کہیں جاتی تو دونوں بھائیوں کی صحت کی طرف سے فکرمند رہا کرتی تھی مگر اس وقت ذرا بھی پریشان نہ تھی۔ جس رحیم وکریم کے گھر پر حاضری دینے جارہی تھی، اسی کی امان میں میں نے اُن کو سونپ دیا تھا بلکہ وہ لوگ ہم دونوں کی طرف سے زیادہ فکرمند تھے مگر جب آخری بار بھائی سے گلے لپٹی تو ضبط کے بندھن دونوں طرف سے ٹوٹ گئے اور میں پلٹ پلٹ کر اس محبوب وحسین چہرے کو دیکھتی رہی۔

ہوائی جہاز پر وہ افراتفری کہ خدا کی پناہ۔ بڑے بڑے کنستروں میں گھی اور جانے کیا کیا بھرا ہوا۔ برقعے اوڑھے عورتیں جو ریل میں بھی شاذ و نادر ہی بیٹھی ہوں گی۔ ہر ایک اس مقدس سفر کے پاک نشے میں سرشار تھا۔ کوئی ساڑھے تین گھنٹے میں رات گئے ہمارا طیارہ جدّہ پہنچا۔ ہر ملک سے جہاز آکر لینڈ کررہے تھے اور بے پناہ ہجوم تھا۔ کئی گھنٹے کی کوشش اور ہندوستانی سفارت خانے کے لوگوں کی مدد سے ہم سب مراحل سے گزر سکے۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ سعودی عرب میں کسی قسم کی کتاب لے جانے کی ممانعت ہے۔ میرے گلے میں کلام پاک حمائل تھا اور سوٹ کیس میں دعاؤں کی، حج وزیارت کے ارکان کی اور کئی کتابیں موجود تھیں۔ اچانک میرے کان میں کسی کسٹم آفیسر کی آواز پڑی جو عابد صاحب سے کہہ رہا تھا کہ آپ کے پاس کوئی کتاب تو نہیں۔ انھیں معلوم نہ تھا۔ کہہ دیا ''نہیں''۔ میں اس وقت سوٹ کیس کھول رہی تھی۔ کتابیں اوپر ہی رکھی تھیں۔ صفائی سے ان کو نکال کر کمال میاں (ہمارے دوست ہدایت محسنی کے سالے) کے حوالے کردیں جو ان کے بیگ میں پہنچ گئیں۔

اگلے دن جدّہ سے ہم چاروں نے مل کر کئی سو در ہم میں ایک ٹیکسی مدینہ تک کے لیے کی۔ اب یہاں امریکہ کے اشتراک سے بہترین سڑکیں بن گئی ہیں جن پر بڑی بڑی شاندار موٹریں چلتی ہیں۔ لوگوں نے ہمیں ڈرا دیا تھا کہ 'ڈرائیور کی ہر بات مان لینا۔ انعام دیتے جانا ورنہ وہ راستے میں بہت پریشان کرے گا۔' سفر چار پانچ گھنٹے میں طے ہونا تھا مگر جہاں جی چاہتا عرب ڈرائیور صاحب قہوہ پینے، آرام کرنے اور بخشش لینے کے لیے ٹھہر جاتے۔ ہم بھی اپنی ربر کی بوتلوں میں پانی بھر لیتے اور چائے پی لیتے تھے۔ بارے سات آٹھ گھنٹے کے سفر کے بعد رات کے ساڑھے دس بجے ہم مدینہ منوّرہ پہنچ پائے۔ ڈرائیور نے سامان سڑک پر ڈال دیا اور چلتا بنا۔

قبلۂ دیدہ ودل سامنے ہے۔ گنبدِ خضرا نظر نہ آرہا ہو مگر چند گز کے فاصلے پر موجود ہے اور ہم دنیا کے مارے بندے اسی فکر میں کھڑے ہیں کہ کیا کریں، کہاں جائیں۔ بھوپال رباط میں ٹھہرنے کا انتظام عابد صاحب کے دوست اعزاز الدین صاحب نے کرایا تھا۔ مگر وہ ہے کہاں یہاں نہ ہادی سکندر کا کوئی وکیل نہ کوئی رہنما۔ مگر رہنمائی کرنے والا تو ہر جگہ موجود ہے۔ ایک لڑکا سامان

اُٹھانے کو ملا۔ باقی ہم سب نے خود اٹھایا اور بھوپال رباط جو قریب ہی تھا، پہنچے۔ اعزاز صاحب دوڑے ہوئے آئے اور میزبانی کے فرائض سنبھال لیے۔ ایک کمرہ پہلی منزل پر خالی تھا۔ دوسری منزل پر وہ خود اور تیسری پر ایک اور کمرہ۔ اعزاز صاحب نے نیچے کے کمرے میں ہمارا سامان رکھوایا۔

اعزاز صاحب اکثر حج کیا کرتے ہیں۔ اس سال بیگم بھی ساتھ آئی تھیں۔ ان بوڑھے میاں بیوی کی گہری اور باوقار محبت اور ایک دوسرے کا خیال رکھنا بہت ہی اچھا لگا۔ بھابی نے چائے پلائی۔ کچھ کھلایا۔ جی بے قرار تھا کہ ابھی روضۂ محبوب پر حاضری دیں مگر اعزاز صاحب نے کہا 'بہت دیر ہو چکی ہے۔ نمازِ تہجّد کے وقت سب چلیں گے'۔ چنانچہ ہم دونوں سو گئے۔

صبح ہونے سے بہت قبل اعزاز صاحب چائے کی دو پیالیوں کے ساتھ جگانے آ گئے۔ جلدی جلدی وضو کر کے تیار ہوئے اور نیچے اُتر آئے۔ آدھے فرلانگ پر مسجد نبویؐ کا ایک دروازہ تھا۔ بے انتہا وسیع و شاندار مسجد پہلے ہی سے عبادت گزاروں سے بھری ہوئی تھی۔ کسی طرح میں، بیگم اعزاز، بیگم عبدالحق عورتوں والے حصّے میں جگہ پا سکے۔ ہمارے داخل ہونے کے ذرا دیر بعد مؤذّن کی باوقار آواز بلند ہوئی اور اپنی خوش بختی پر آنکھیں بھر آئیں۔ اس سے پہلے میں نے کبھی تہجّد کی نماز نہیں پڑھی تھی۔ (میری والدہ اکثر پڑھتی تھیں) یہاں باقاعدہ تہجّد کی اذان ہوتی ہے اور سب لوگ نمازِ فجر سے پہلے تہجّد پڑھتے اور پھر قرآن اور دعائیں پڑھتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ فجر کا وقت آ جاتا ہے۔

نماز کے بعد ہم دونوں نے اپنی کتابیں سنبھالیں۔ کچھ کتابوں کی مدد سے کچھ زبانی دعائیں پڑھتے ہوئے اپنے محبوب رہبر و ہادیؐ کے روضۂ اقدس پر حاضری دی۔ آں حضرتؐ کے روضہ کی جالیوں کے سامنے کھڑے ہو کر پہلے پہل تو بس یہ محسوس ہوا کہ اب دنیا میں اور کیا چاہیے۔ دل چاہتا تھا روضۂ اقدس کی جالیوں کو آنکھوں سے لگاؤں اور اشکوں سے تر کر دوں۔ مگر ہر کونے پر محافظوں کے پُرخشونت چہرے زائروں کو گھورتے نظر آتے تھے۔ ان کی ڈیوٹی تھی کہ کسی کو جالی چھونے نہ دیں۔

ایک دن ملک صاحب کے ساتھ ہم مسجدِ قُبا کی زیارت کے لیے گئے۔ مسجد نبویؐ میں تو جگہ بہت مشکل سے ملتی ہے۔ مگر یہ سب سے پہلی مسجد تھی جس میں آں حضرتؐ نے مدینہ میں داخل ہو کر نماز ادا فرمائی، زائروں کے لیے کم مقدّس نہیں۔ یہاں بھی نماز ادا کی۔ اس کے منبر کو اپنے ہاتھوں سے چھوا، اس کی سیڑھی کو بوسہ دیا جس پر بیٹھ کر آقائے کائناتؐ خطبہ فرماتے تھے۔ (منبر وہ نہ سہی جگہ تو وہی ہے۔ یہ سعادت کیا کم ہے)۔ یہیں آ کر تو آں حضرتؐ نے اطمینان کا پہلا سانس لیا۔ یہیں آنے کے بعد مدینے کی غریب و شریف آبادی نے آپؐ کو سر آنکھوں پر بٹھایا اور اسلام کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ یہیں سے تو دنیا میں اسلام کی وحدانیت کی تعلیم پھیلی۔ مسجد قباء میں جس لگن اور سکون سے عبادت ہو سکی دوسری جگہ مجمع کی وجہ سے ممکن نہ تھی۔

(صالحہ عابد حسین)

مشق

سوالات

1۔ دیارِ حبیبؐ میں مصنّفہ کے حاضر ہونے کی آرزو کس طرح پوری ہوئی؟
2۔ مصنّفہ نے ہوائی جہاز کے اندر کا کیا منظر بیان کیا ہے؟
3۔ مسجدِ نبویؐ میں داخل ہونے کے بعد مصنّفہ پر کیا کیفیت طاری ہوئی؟
4۔ مسجد قباء کے بارے میں مصنّفہ نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟

© NCERT not to be republished

ڈراما

ڈراما ادب کی ایک اہم صنف ہے۔اس کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں مگر اس کی ایک سادہ سی تعریف یہ ہے کہ ''ڈراما کسی قصّے یا واقعے کو ادا کاروں کے ذریعے، ناظرین کے روبرو عملاً پیش کرنے کا نام ہے۔'' اس سے واضح ہوا کہ ڈراما ناول یا افسانے کی طرح صرف لکھنے یا پڑھے جانے تک محدود نہیں ہوتا اس کے لیے پیش کش ضروری ہے۔ یہ مکمل تب ہوتا ہے جب اسے عملاً اسٹیج پر پیش کر دیا جائے۔ ناول اور افسانے کی طرح ڈرامے میں بھی پلاٹ، کردار، مکالمہ اور کوئی نہ کوئی مرکزی خیال ہوتا ہے۔

ڈرامے کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ 1۔ المیہ (Tragedy) 2۔طربیہ (Comedy)۔ ان دونوں عناصر یعنی الم و طرب کے امتزاج سے بھی ڈرامے لکھے گئے ہیں۔

اردو ڈرامے کی ابتدا 1844 سے 1855 کے دوران واجد علی شاہ کی ڈرامائی پیش کش اور امانت و مداری لال کی اندر سبھاؤں سے لکھنؤ میں ہوئی۔ مگر اسے عروج حاصل ہوا پارسی تھیٹر کے ڈراموں سے۔ جس زمانے میں لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح میں اندر سبھاؤں کی دھوم مچی ہوئی تھی، اسی زمانے میں ممبئی میں مغربی اثرات کے تحت ایک نئے قسم کا ڈراما وجود میں آ رہا تھا جسے پارسی تھیٹر کا نام دیا گیا۔

پارسی تھیٹر کے ڈرامے ابتدائی اردو ڈراموں کی طرح منظوم ہوتے تھے۔ ان میں رقص، موسیقی اور گانوں کا استعمال بھی ویسا ہی تھا مگر پیش کش کا انداز ابتدائی ڈراموں سے مختلف تھا۔ اب اسٹیج کی پچھلی دیوار پر سینریوں والے پردے لگائے جانے لگے۔ ہر ذیلی سین پر بھی پردہ گرنے اور اٹھنے لگا۔ اسٹیج پر طرح طرح کی مشینوں کا استعمال ہونے لگا۔ مکالموں میں دھیرے دھیرے نثر کا استعمال بڑھا، گانے کم ہو گئے۔ فوق فطری واقعات اور کرداروں کے بجائے روز مرّہ زندگی کے واقعات اور مسائل ڈرامے کا موضوع بننے لگے۔

© NCERT not to be republished

ابراہیم یوسف

(2001-1925)

ابراہیم یوسف کی پیدائش بھوپال میں ہوئی۔ انھوں نے اُردو اور سیاسیات میں وکرم یونیورسٹی سے ایم اے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ایڈ کیا۔ ہائر سیکنڈری اسکول بھوپال کے پرنسپل کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔

'سوکھے درخت' 'طنزیہ ڈرامے'، 'دھوئیں کے آنچل' اور 'پانچ چھے ڈرامے' ان کے ڈراموں کے مجموعے ہیں۔ انھوں نے ایک قدیم ڈراما ''صولتِ عالم گیری'' بھی ترتیب دیا ہے۔ ان کا ایک ناول '' آبلے اور منزلیں'' بھی شائع ہو چکا ہے۔ ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کو اقبال سمّان، مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کا میر تقی میر ایوارڈ اور غالب ایوارڈ سے نوازا گیا۔

'ہندی ادب کی تاریخ' اور 'اندر سبھا اور اندر سبھائیں' بھی ابراہیم یوسف کی مشہور تصانیف ہیں۔

© NCERT not to be republished

5287CH10

مرزا غالبؔ

کردار:

اُمراؤ بیگم	مرزا غالبؔ کی بیوی
کلّو	مرزا غالبؔ کا نوکر
وفادار	مرزا غالبؔ کی نوکرانی
کلیان	مرزا غالبؔ کا ملازم

(دو گورے اور ایک ہندوستانی، دو چار پڑوسی)

مرزا غالبؔ دالان میں ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ سامنے پیچوان رکھا ہے۔ چہرے سے پریشانی اور فکرمندی ظاہر ہورہی ہے۔ کبھی کبھی پیچوان سے کش لیتے ہیں۔ کچھ دیر بعد اُمراؤ بیگم دالان میں آتی ہیں۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے ساتھ غصّہ بھی ہے۔ مرزا غالبؔ نظر اٹھا کر اُمراؤ بیگم کو دیکھتے ہیں۔

امراؤ بیگم : (جھنجھلاہٹ سے) ان صاحب زادوں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ایسی ضد کرتے ہیں کہ۔۔۔۔۔۔

مرزا غالبؔ : (بات کاٹ کر) کیا مقدمہ درپیش ہے بیگم جو یوں آپے سے باہر ہوئی جارہی ہیں؟

امراؤ بیگم : کیا مقدمہ درپیش ہوگا، بس یہ ضد ہیں کہ میٹھا پانی پییں گے کل بارش کے وقت ایک گھڑا پانی جمع کیا تھا سو وہ آپ کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔

مرزا غالبؔ : (مُسکرا کر) بیگم! وہ بارش ہی کا تو پانی ہے، آبِ زمزم تو نہیں۔

امراؤ بیگم : بس آپ کی انھیں ناز برداریوں نے تو انھیں ضدّی بنا دیا ہے۔

مرزا غالبؔ : اب وہ ہم سے ضد نہیں کریں گے تو اور کس سے کریں گے؟

امراؤ بیگم : لیکن ضد کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

© NCERT not to be republished

مرزا غالبؔ : (بات ٹالنے کے انداز میں) ارے ہاں بیگم! نواب ضیاالدین احمد خاں نے آپ کے وظیفے کے روپے بھیجے کہ نہیں؟

امراؤ بیگم : جی ابھی تک نہیں۔

مرزا غالبؔ : ویسے تو وہ ہمیشہ روپے مقرّرہ وقت پر بھیجتے ہیں۔

امراؤ بیگم : جی ہاں اس بار جانے کیوں تاخیر ہوگئی۔

مرزا غالبؔ : وہ خود مجبور ہوں گے۔ شہر تو دوزخ کا نمونہ بنا ہوا ہے۔ اگر ایک دوروز میں روپیہ نہیں آیا تو بس اللہ ہی اللہ ہے۔

امراؤ بیگم : توشہ خانے میں بھی اب کچھ نہیں ہے۔ شام کی فکر الگ کھائے جارہی ہے۔

مرزا غالبؔ : (مُسکرا کر) بیگم! آپ تو نفلی روزے ہی شروع کردیں گی مگر میرا کیا ہوگا اور پھر صاحب زادے ہیں، ابھی تو اُن پر روزے بھی فرض نہیں ہیں۔

امراؤ بیگم : خدا کے لیے اس وقت تو تمسخر نہ کیجیے۔

مرزا غالبؔ : واللہ، بیگم سچ کہتا ہوں۔ خیر مجھے بھی جانے دیجیے، آخر گھر میں کلّو ہے، کلیان ہے، نیاز علی اور ایاز ہیں، اور وفادار ہیں، یہ کس پاداش میں بھوکے رہیں گے؟

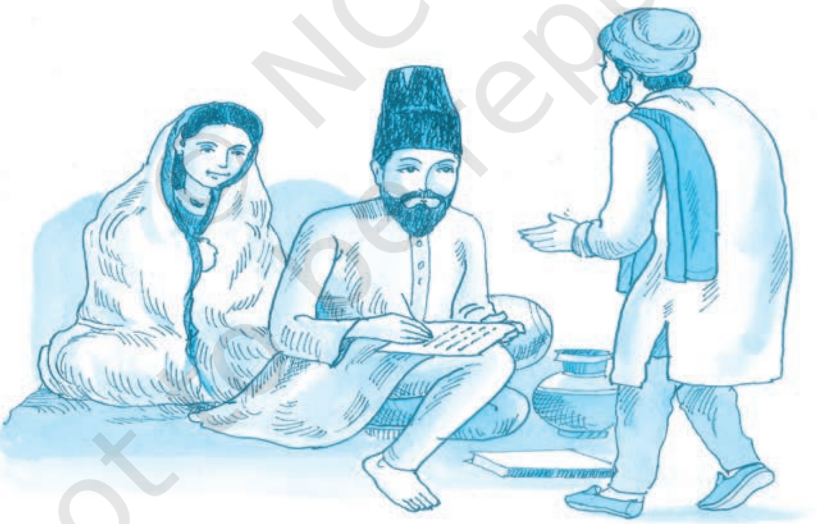

امراؤ بیگم : اب یہ لوگ بچّے نہیں کہ حالات نہ دیکھ رہے ہوں۔ (کلّو آتا ہے، امراؤ بیگم اسے دیکھ کر) یہ لیجیے وہ کلّو آ گیا۔

مرزا غالبؔ : (کلّو کی طرف دیکھ کر) کیوں میاں کلّو! کیا خبر لائے، شہر کا کیا حال ہے؟

کلّو : دھائیں دھائیں گولیاں چل رہی ہیں سرکار۔

مرزاغالبؔ : کچھ مرزا یوسف کی بھی خبر پائی؟

کلّو : سرکار! شہر میں تو ایک قیامتِ صغریٰ بپا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی مگر مہاراجہ پٹیالہ کے آدمیوں نے دیوار کے دوسری جانب جانے ہی نہیں دیا۔

مرزاغالبؔ : مجھے اس کی فکر کھائے جارہی ہے۔

امراؤ بیگم : جانے بے چارے کس حال میں ہیں۔

مرزاغالبؔ : (گھبرا کر) میاں کلّو! جا کر خبر لاؤ، آخر کیا ماجرا ہے؟

کلّو : سرکار! کچھ گورے دیوار پھاند کر اندر گھس آئے ہیں۔

مرزاغالبؔ : لاحول ولاقوۃ اِلاّ باللہ (امراؤ بیگم سے) آپ اندر جائیے، جانے کم بخت کیا فساد پیدا کریں۔ (مرزاغالبؔ برابر دالان میں ٹہلتے رہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد دوتین گورے اور دوتین ہندوستانی سپاہی اندر آتے ہیں، ایک گورا مرزاغالبؔ کو دیکھ کر)

پہلا گورا : وِل! تم ہی مرزا نوشہ ہے؟

مرزاغالبؔ : ہاں میں ہی مرزا نوشہ ہوں۔

پہلا گورا : تم ہی بادشاہ کی غزلیں بناتا تھا؟

مرزاغالبؔ : ہاں، میں ہی یہ مزدوری کرتا تھا۔

دوسرا گورا : مزدوری کرتا تھا یا اس کا نوکر تھا؟

مرزاغالبؔ : اسے مزدوری سمجھو یا نوکری مگر اس فتنۂ آشوب میں، میں نے کسی مصلحت میں دخل نہیں دیا۔

دوسرا گورا : ہم کیسے جانیں کہ تم بادشاہِ دہلی کا وفادار نہیں؟

مرزاغالبؔ : نہ میں کالوں کے زمانے میں کہیں گیا اور نہ گوروں کے زمانے میں گھر سے باہر نکلا۔ کرنل برون صاحب کے زبانی حکم پر میری یہاں اقامت کا مدار ہے۔

پہلا گورا : پھر تم کو کرنل برون کے سامنے اپنی صفائی دینا ہوگی۔
(مرزاغالبؔ کچھ سوچتے ہوئے) کیا سوچتا ہے؟ تمھیں ضرور کرنل برون کے سامنے چلنا ہوگا۔

مرزاغالبؔ : خیر بھائی! چلتا ہوں۔ (آگے بڑھتے ہیں) چلیے۔

© NCERT not to be republished

(کلیان داخل ہوتا ہے۔ سر پر ایک بڑی سی چوٹی ہے اور دھوتی باندھے ہے۔ بغل میں کپڑے میں لپٹی ایک بوتل اور کاندھے پر ایک وزنی تھیلا ہے۔ تھیلا زمین پر رکھ کر کپڑے میں لپٹی بوتل اُس پر رکھتا ہے اور امراؤ بیگم کو دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر کر)

کلیان : بیگم صاحبہ! ابھی میں نے دیکھا کہ سرکار کچھ گورے سپاہیوں کے ساتھ..... (آواز نڈھال ہوجاتی ہے۔ وہ خاموش ہوکر آستین سے آنسو پونچھتا ہے، امراؤ بیگم اس کی طرف دیکھ کر پریشانی کے لہجے میں)

امراؤ بیگم : بھئی تم لوگ مجھے دیوانہ بنا کردم لوگے (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) کدھر جا رہے تھے وہ لوگ؟

کلیان : حاجی قطب الدین سوداگر کے مکان کی طرف۔ وہیں کچھ گوروں کا کیمپ ہے۔

(امراؤ بیگم خاموش رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد مرزا غالبؔ چہرے پر پریشانی مگر ہونٹوں پر مُسکراہٹ لیے داخل ہوتے ہیں۔ مرزاؔ کو دیکھ امراؤ بیگم کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور بے اختیار زبان سے نکلتا ہے۔)

امراؤ بیگم : میں پہلے شکرانے کا دوگانہ ادا کرلوں، پھر حاضر ہوتی ہوں۔

مرزا غالبؔ : دوگانہ بھی ادا کر لیجیے گا، اب سُنیے جب میں کرنل برون کے سامنے پیش ہوا تو اس نے کہا ''ول تم مسلمان ہے۔'' میں نے کہا آدھا۔ وہ مسکرایا اور باعزّت رہائی کا حکم دے دیا۔ اب فرمایئے پورے مسلمان کو یہ سعادت نصیب ہوتی ؟''

امراؤ بیگم : (مُسکراکر) آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ (امراؤ بیگم کچھ دیر خاموش رہ کر) کلیان خبر لایا ہے کہ میاں کالے صاحب کی حویلی کو گوروں نے ڈھا ڈالا۔

مرزا غالبؔ : (ٹھنڈی سانس بھرکر) ایک میاں کالے صاحب کی حویلی کا کیا رونا بیگم، سارا شہر کھنڈر ہے۔ اگر کوئی سیّاح آئے تو دریبہ، چاوڑی، اجمیری دروازے کا بازار، اردو بازار، بُلاقی بیگم کا کوچہ، خان دروازے کا بازار، گنتا پھرے اور کہے کہ اسی شہر کو دلّی والے'' عالم میں انتخاب'' کہتے تھے۔

امراؤ بیگم : مگر میاں کالے کی حویلی میں میں نے اپنے زیورات اور قیمتی پوشاکیں منتقل کر دی تھیں۔

مرزا غالبؔ : (امراؤ بیگم کا چہرہ غور سے دیکھ کر پریشانی کے لہجے میں) واللہ بیگم! آپ نے اس امر کی ہمیں اطلاع تک نہیں دی۔

امراؤ بیگم : میں نے سوچا کہ میاں کالے صاحب مذہبی آدمی ہیں، نہ ان سے باز پرس ہوگی اور نہ کسی قسم کی دار و گیر۔

(مرزا غالبؔ پریشان اور فکرمند بیٹھ جاتے ہیں۔ امراؤ بیگم اور وفادار آہستہ آہستہ چلی جاتی ہیں۔ کچھ دیر بعد

(کلّو آتا ہے)

مرزا غالبؔ : (بے چینی سے) مرزا یوسف کی کچھ خبر لائے؟

کلّو : ماما اور ملازم کو پریشان کر رکھا ہے۔ جب گولیوں کی آواز سنتے ہیں گھر سے باہر تشریف لے آتے ہیں۔کل رات کچھ گورے گھر میں گُھس آئے تھے۔

مرزا غالبؔ : خدا اس دیوانے کے حال پر رحم فرمائے۔کوئی ناخوشگوار واقعہ تو پیش نہیں آیا؟

کلّو : ماما اور ملازم کے گڑگڑانے پر اور تو کچھ نہیں کیا مگر کچھ سامان ضرور اُٹھا لے گئے۔

مرزا غالبؔ : اس لوٹ کھسوٹ میں نہ بڑا بھائی بچا نہ چھوٹا۔

(مرزا یوسف کا نوکر گھبرایا ہوا آتا ہے۔ چہرے سے پریشانی اور وحشت طاری ہو رہی ہے مرزا غالبؔ کو دیکھ کر)

نوکر : حضور، سرکار ایک گورے کی گولی سے......

مرزا غالبؔ : (ٹھنڈی سانس بھر کر) شہید ہو گئے۔ اِنّاللہ وانّا الیہ راجعون (کچھ دیر بالکل خاموش کھڑے رہتے ہیں پھر نوکر کی طرف دیکھ کر)............میاں! یہ واقعہ کیوں کر ہوا؟

نوکر : چند گورے گلی میں گھس آئے تھے۔ دھنا دھن گولیاں چلا رہے تھے۔ سرکار باہر جانے لگے۔ میں نے ہر چند روکا مگر مجھ بڈھے سے بے قابو ہو کر باہر نکل ہی گئے اور پھر ان کم بخت گوروں نے یہ نہ سوچا کہ دیوانے آدمی ہیں۔ دھائیں دھائیں گولیاں چلا دیں۔

(مرزا غالبؔ پریشانی کے عالم میں دالان میں ٹہلنے لگتے ہیں۔کلّو کچھ دیر بعد)

کلّو : میں جا کر کچھ محلے والوں کو جمع کرتا ہوں کہ۔۔۔۔۔۔

مرزا غالبؔ : مگر آئے گا کون۔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز۔

(ایک سپاہی اور چند لوگ آتے ہیں)

پہلا شخص : مرزا غالبؔ! ہمیں افسوس ہے کہ......خدا اس شہید کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔

مرزا غالبؔ : میاں! آپ حضرات تشریف لائے۔ میری عزّت بڑھائی، یہ بہت ہے مگر۔۔۔۔۔۔

دوسرا شخص : آپ فکر نہ فرمائیں، ہم سے جو کچھ بن سکے گا، حتی المقدور اس میں کوتاہی نہ کریں گے۔

مرزا غالبؔ : خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔ مرزا یوسف تو دیوانہ تھا مگر میں تو ہوش و حواس میں ہوں۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ

میں آپ کے ساتھ نہ چلوں۔

دوسرا شخص : آپ کا گھر سے نکلنا مصلحتِ وقت نہیں ہے۔آپ تشریف رکھیے اور ہمیں اجازت دیجیے۔

مرزا غالبؔ : مگر یہاں اس وقت غسّال اور گورکن کا کہاں سے انتظام ہوگا۔

پہلا شخص : یہ فرائض تو ہم خود ہی انجام دے لیں گے،مگر بزاز کا اس وقت ملنا واقعی امرِ محال ہے۔

مرزا غالبؔ : (کلّو کی طرف دیکھ کر) میاں کلّو! بیگم سے کہو گھر سے سفید چادریں دے دیں۔
(کلّو گھر کے اندر چلا جاتا ہے۔مرزا غالبؔ سب کی طرف دیکھ کر) واللہ حضرات! آپ مجھ پر وہ احسانِ عظیم فرما رہے ہیں کہ تا زندگی میں فراموش نہ کرسکوں گا۔

پہلا شخص : حضرت آپ کیا فرما رہے ہیں۔کیا ہم آپ کے مرتبے سے واقف نہیں اور پھر حق ہمسائگی بھی کوئی چیز ہے۔ ہم آپ کے ان احسانوں کو کیوں کر فراموش کرسکتے ہیں جو آپ ہم پر فرماتے رہے ہیں۔
(کلّو چادریں لے کر آتا ہے۔مرزا غالبؔ چادروں کو دیکھ کر)

مرزا غالبؔ : مرزا یوسف سے کہنا کہ تیرا بھی کوئی بھائی تھا۔جب موت آئے گی تو تیرے پاس آرہوں گا۔اپنی بے کسی اور مجبوری کی تجھ سے داد چاہوں گا۔(سب کی طرف دیکھ کر)
حضرات خدا حافظ۔

(سب لوگ آہستہ آہستہ گردن جھکائے چلے جاتے ہیں۔مرزا غالبؔ تنہا کھڑے رہ جاتے ہیں۔کچھ دیر بعد امراؤ بیگم آہستہ آہستہ آتی ہیں۔ان کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔مرزا غالبؔ اُنھیں دیکھ کر) آپ کی آنکھوں میں آنسو! بیگم نہ یہ شکر کا مقام نہ شکایت کا۔غالبؔ رحمتہ اللہ علیہ کا یہ شعر کس قدر حسبِ حال ہے۔

ہوچکیں غالبؔ بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

(گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں اور خلا، میں گھورتے ہوئے)
''اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے''۔

(پردہ)

(ابراہیم یوسفؔ)

مشق

سوالات

1۔ کلّو نے شہر کا کیا حال بیان کیا؟

2۔ نوکر نے مرزا یوسف کے حالات کس طرح بیان کیے؟

3۔ دلّی کو عالم میں انتخاب کہنے پر غالبؔ نے مذاق کیوں اڑایا تھا؟

4۔ مرزا یوسف کی موت پر غالبؔ کو کن کن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا؟

© NCERT not to be republished

سید سلیمان ندوی

(1953–1884)

سیّد سلیمان ندوی صوبۂ بہار کے گاؤں دیسنہ (ضلع نالندہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی میں حاصل کی۔ ۱۹۰۱ء میں علّامہ شبلی نعمانی کی قائم کردہ اسلامی درس گاہ دارالعلوم ندوۃ العلما (لکھنؤ) میں داخل ہوئے جہاں اُن کے ادبی اور علمی ذوق کو جِلا ملی۔ وہ جدید عربی کے بھی بہت اچھے ادیب تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اپنے استاد مولانا شبلی کی نامکمّل تصنیف 'سیرۃ النّبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم'، کو انھوں نے مکمّل کیا۔ 'سیرتِ عائشہؓ' ان کی دوسری اہم سوانحی تصنیف ہے۔ 'نقوشِ سلیمانی' میں کئی اہم مضامین شامل ہیں۔ 'ہندعرب تعلقات' ان کی مشہور کتاب ہے۔

وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ دارالمصنّفین (اعظم گڑھ) کا قیام اور ماہ نامہ 'معارف' کا اجرا ان کے اہم کارنامے ہیں۔ ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے غیر ملکی سفر بھی کیے۔

© NCERT not to be republished

5287CH11

حضرت عائشہؓ کی سیرت کے چند پہلو

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدّیقہؓ نے بچپن سے جوانی تک کا زمانہ اس ذاتِ اقدس کی صحبت میں بسر کیا جو دنیا میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے آئی تھی۔ چنان چہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا اخلاقی مرتبہ نہایت بلند تھا۔ وہ نہایت سنجیدہ، فیاّض، قانع، عبادت گزار اور رحم دل تھیں۔

حضرتِ عائشہؓ کی ذات میں قناعت اور شکر گزاری دونوں مجتمع تھیں۔ انھوں نے اپنی ازدواجی زندگی بڑی عُسرت اور فقروفاقہ سے بسر کی لیکن کبھی شکایت کا کوئی حرف زبان پر نہ لائیں۔ بیش بہا لباس، گراں قیمت زیور، عالی شان عمارت، لذیذ الوانِ نعمت، ان میں سے کوئی چیز شوہر کے ہاں ان کو حاصل نہیں ہوئی۔ وہ دیکھتی تھیں کہ فتوحات کا خزانہ سیلاب کی طرح ایک طرف سے آتا اور دوسری طرف سے نکل جاتا ہے۔ تاہم کبھی ان کی طلب ان کی دامن گیر نہ ہوئی۔

خدا نے اولاد سے محروم رکھا تھا تو حضرت عائشہؓ عام مسلمانوں کے بچّوں اور زیادہ تر یتیموں کی پرورش کیا کرتی تھیں۔ ان کی تعلیم وتربیت کرتیں اور ان کی شادی بیاہ کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ عورتیں جب آں حضرتؐ کی خدمت میں کوئی ضرورت لے کر آتیں تو حضرتِ عائشہؓ ان کی اعانت اور سفارش حضور میں کیا کرتی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی اطاعت وفرماں برداری اور آپؐ کی مسرت ورضا کے حصول میں شب و روز کوشاں رہتیں۔ اگر آپؐ کے چہرے پر ذرا بھی حزن وملال یا کبیدہ خاطری کا اثر نظر آتا تو بے قرار ہو جاتیں۔

حضرتِ عائشہ صدّیقہؓ کبھی کسی کی برائی نہ کرتی تھیں۔ ان کی روایتوں کی تعداد ہزاروں تک ہے مگر اس دفتر میں کسی شخص کی توہین یا کسی کے لیے بدگوئی کا ایک حرف بھی نہیں ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص کا ذکر چلا۔ اِتّفاق سے آپ نے اس کو اچّھا نہیں کہا۔ لوگوں نے بتایا۔ ’’اُمّ المومنین! اس کا تو انتقال ہو چکا ہے۔‘‘ یہ سن کر فوراً ہی اس کی مغفرت کی دعا مانگتی ہیں۔ جواب دیا، ’’حضورؐ کا ارشاد ہے کہ مُردوں کو بھلائی کے سوا یاد نہ کرو۔‘‘

کسی کا احسان کم ہی قبول کرتی تھیں اور اگر کر لیتی تھیں تو اس کا معاوضہ ضرور ادا کر دیتی تھیں۔

© NCERT not to be republished

عام انسانوں سے انصاف پسندی کا ظہور کم ہوتا ہے لیکن تربیت نبویؐ سے کمالِ اخلاق ہی کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدّیقہؓ کمالِ خودداری کے ساتھ انصاف پسند بھی تھیں۔

آپ نہایت شجاع اور پُر دل تھیں۔ میدانِ جنگ میں آکر کھڑی ہوجاتی تھیں۔ غزوۂ احد کے موقعے پر اپنی پُشت پر مشک لاد کر زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ غزوۂ خندق میں جب چاروں طرف سے مشرکین محاصرہ کیے ہوئے تھے اور شہر کے اندر یہودیوں کے حملے کا خوف تھا، حضرت عائشہؓ بے خطر قلعے سے باہر نکل کر مسلمانوں کی جنگ کا نقشہ ملاحظہ کرتی تھیں۔

حضرت عائشہؓ کے اخلاق کا سب سے ممتاز جوہر ان کی طبعی فیّاضی اور کشادہ دستی تھی۔ خیرات میں تھوڑے بہت کا لحاظ نہ کرتیں بلکہ جو موجود ہوتا، سائل کو دے دیتیں۔ ایک دفعہ ایک سائلہ آئی جس کے ساتھ دو ننّھے بچّے تھے۔ اتفاق سے اس وقت گھر میں کچھ نہ تھا سوائے ایک چھوہارے کے۔ اسی کو دو ٹکڑے کرکے دونوں بچّوں کو دے دیا۔ دوسری دفعہ ستّر ہزار کی رقم خدا کی راہ میں دے دی۔ امیر معاویہؓ نے ایک لاکھ دِرہم بھیجے۔ شام ہوتے ہوتے ایک حبّہ بھی پاس نہ رکھا، سب محتاجوں کو دے دیا۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اُن کے بھانجے تھے اور خالہ کی نظر میں سب سے زیادہ چہیتے۔ وہ زیادہ تر آپ کی خدمت میں رہتے۔ آپ کی فیّاضی کو دیکھتے دیکھتے وہ بھی گھبرا گئے اور کہیں ان کے منہ سے نکل گیا کہ ''اب ان کا ہاتھ روکنا چاہیے''۔ خالہ کو معلوم ہوا تو قسم کھالی کہ ''اب کبھی ابنِ زبیرؓ سے بات نہ کروں گی۔ وہ میرا ہاتھ روکے گا؟'' ابن زبیرؓ مدت تک معتوب رہے۔ آخر بڑی مشکل سے انھیں معاف فرمایا۔

فقرا اور اہلِ حاجت کی اعانت ان کے حسبِ حیثیت کرنا چاہیے۔ اگر کوئی ضرورت مند تمھارے پاس آتا ہے تو اس کی حاجت براری ہی اس کے درد کی دوا ہے لیکن اگر اس سے زیادہ عزّت دار آدمی ہے تو حاجت براری کے ساتھ وہ کسی قدر عزّت و تعظیم کا بھی مُستحق ہے۔ حضرت عائشہؓ اس نکتے کو ہمیشہ مدِّ نظر رکھتی تھیں۔ ایک دفعہ ایک سائل آیا۔ اس کو روٹی کا ٹکڑا دے دیا۔ وہ چل دیا۔ اس کے بعد ایک اور شخص آیا جو کسی قدر عزّت دار معلوم ہوتا تھا۔ اس کو بیٹھا کر کھانا کھلایا، پھر رخصت کیا۔ لوگوں نے دریافت کیا، ''ان دونوں کے ساتھ الگ الگ برتاؤ کیوں کیا گیا؟''

فرمایا، ''آں حضرتؐ کا ارشاد ہے کہ لوگوں کے ساتھ ان کے حسبِ حیثیت برتاؤ کرنا چاہیے۔''

(سید سلیمان ندوی)

مشق

سوالات

1۔ حضرت عائشہ صدّیقہؓ نے کیسی زندگی بسر کی؟

2۔ حضرت عائشہ صدّیقہؓ بچّوں اور یتیموں کے ساتھ کیسا سلوک کرتی تھیں؟

3۔ حضرت عائشہ صدّیقہؓ کی شجاعت کن واقعات سے ظاہر ہوتی ہے؟

4۔ حضرت عائشہ صدّیقہؓ کی فیّاضی سے متعلق کوئی واقعہ لکھیے۔

© NCERT not to be republished

5287CH12

رابندر ناتھ ٹیگور

رابندر ناتھ ٹیگور کی پیدائش کولکاتا کے جوراسنکو میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام مہرشی دیبیندر ناتھ ٹیگور اور ماں کا نام شاردا دیوی تھا۔ گھر کے تمام لوگ بچپن میں انھیں 'ربی' کے نام سے پکارتے تھے۔ ان کی ماں کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔ والد کی تربیت نے ان کی شخصیت کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ رابندر ناتھ ٹیگور کو نیٹل سیمنیری اسکول میں داخل کرایا گیا۔ انھوں نے سینٹ زیویرس اسکول میں تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھی گئے۔

11 مئی 1875 کو انھوں نے پہلی بار ہندو میلے کے عوامی مجمعے کے سامنے اپنی نظم ''بن پھول'' پیش کی۔ اس میلے کو شروع کرنے کا خاص مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں میں اپنی زبان، تاریخ، وراثت، تہذیب، موسیقی اور آرٹ سے محبت پیدا کی جائے۔ اُن کی یہ نظم آج بھی عوام میں مقبول ہے۔

رابندر ناتھ نے انگلستان میں دوران تعلیم ''ہندوستانیوں پر انگریزوں کے مظالم'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ انھوں نے یہ مضمون اپنے استاد ہنیری مورلے کو دے دیا اور دوسرے دن یہ سوچ کر اُن کی کلاس میں نہیں گئے کہ استاد ناراض ہوں گے۔ لیکن مورلے پر اس مضمون کا اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے اسے پوری کلاس کو پڑھ کر سنایا۔

انگلستان میں اُن کا قیام صرف ڈیڑھ سال رہا۔ اس دوران وہ پابندی سے اپنی تخلیقات رسالہ ''بھارتی'' میں اشاعت کے لیے بھیجتے رہے۔ واپسی کے بعد انھوں نے ''ساندھیہ سنگیت'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ادب سے دل چسپی رکھنے والوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت کے کچھ دنوں بعد رابندر ناتھ ایک شادی میں گئے وہاں مشہور زمانہ ناول نگار بنکم چندر چٹر جی بھی آئے ہوئے تھے۔ میزبان انھیں دیکھ کر ایک ہار لے کر ان کے استقبال کے لیے لپکے لیکن بنکم چندر نے وہ ہار رابندر ناتھ کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا کہ اس اعزاز کا صحیح حق دار یہ نوجوان ہے۔ بنکم چندر کی زبان سے ایسے کلمات نکلنا اُن جیسے نوجوان ادیب کے لیے فخر کی بات تھی۔ اُن کی شہرت و مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ 1886 میں کولکاتا میں انڈین نیشنل

© NCERT not to be republished

کانگریس کا دوسرا اجلاس ہوا جس کے صدر دادا بھائی نوروجی تھے۔ اس اجلاس میں رابندر ناتھ نے اپنا ایک گیت سنایا۔ جو سادہ بنگالی زبان میں تھا۔

رابندر ناتھ کو خدا نے لکھنے کی زبردست صلاحیت دی تھی۔ انھوں نے متعدد کہانیاں، نظمیں، گیت، ناول، ڈرامے اور مضامین لکھے۔ اُن کا کافی وقت اسی میں گزرتا تھا۔ لیکن خاندان کے لیے اپنے فرائض کی ادائیگی میں انھوں نے کبھی کوتاہی نہیں برتی۔ اس کے لیے انھیں کافی عرصہ شیلیا داگاؤں میں رہنا پڑا جو دریائے پدما کے کنارے آباد تھا۔ گاؤں میں رابندر ناتھ کو کسانوں کی سیدھی سادی زندگی نے بے حد متاثر کیا۔ وہاں کی خاموش اور پرسکون فضا بھی اُن کے مزاج کو راس آئی۔ جیسے جیسے گاؤں کے لوگوں سے اُن کے روابط بڑھے اُن میں یہ احساس بیدار ہونا شروع ہوا کہ ہندوستان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے گاؤں کی خوش حالی اور ترقی ضروری ہے۔ انھوں نے گاؤں کی فلاح و بہبود کے لیے کئی کام کیے۔ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ ہر شخص کو اپنی مادری زبان سیکھنا چاہیے۔ انھوں نے لکھا ہے۔ ''بالکل اس بچّے کی طرح جو اپنی ماں کے دودھ سے سب سے زیادہ صحت مند اور مضبوط اٹھتا ہے، اگر انسان کی مادری زبان میں اُسے تعلیم دی جائے تو اُس کا دل و دماغ بھی سب سے زیادہ مضبوط بنتا ہے۔''

رابندر ناتھ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ہندوستان کی ترقی کے لیے ہندوستانیوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ انھوں نے اپنے والد سے شانتی نکیتن میں ایک اسکول کھولنے کی اجازت مانگی، جہاں گُروکُل کے پرانے انداز میں تعلیم کا انتظام ہو۔ ان کے والد نے خوشی سے انھیں اسکول کھولنے کی اجازت دے دی۔ شانتی نکیتن میں اُن کا ایک گھر پہلے سے موجود تھا۔ انھوں نے وہاں سات ایکڑ زمین اس طرح خریدی کہ یہ گھر درمیان میں آ گیا۔ یہاں سب سے پہلے ایک لائبریری اور ایک لیبوریٹری کا قیام عمل میں آیا۔ اس پورے خطے کو اسکول کی شکل دینے کے لیے کافی بڑی رقم درکار تھی۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے حصّے کی کچھ جائداد اور اپنی بیوی کے زیورات بیچ دیے۔

اسی دوران انھیں بعض تکلیف دہ سانحات سے گزرنا پڑا۔ پہلے اُن کی بیوی کا اور چھ مہینے بعد اُن کی ایک بیٹی کا بھی انتقال ہوگیا۔ 1905 میں اُن کے والد بھی چل بسے۔ انھیں سب سے بڑا صدمہ اُس وقت پہنچا جب 1907 میں اُن کا چھوٹا بچّہ سُمیندر بھی انتقال کر گیا۔ ان پے درپے سانحوں کے باوجود انھوں نے اسکول کا کام متاثر نہ ہونے دیا۔ اس کی کلاسیں کھلے میدانوں میں درختوں کے سائے میں ہوتیں۔ شاگرد اور استاد میں ایک ہی خاندان جیسا رشتہ ہوتا تھا۔ سارے کام وہ مل جل کر کرتے۔ ان کا یہ طرزِ تعلیم نہایت کامیاب ثابت ہوا۔

1912 میں ٹیگور کی طبیعت خراب ہوگئی۔ انھوں نے اپنی کچھ نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ اسی دوران

انھیں اپنے علاج کے لیے ملک سے باہر جانا پڑا لیکن انھوں نے ترجمے کا کام جاری رکھا۔

لندن میں ایک دوست کے توسّط سے ان کی ملاقات مشہور آئرش شاعر ڈبلیو بی ییٹس (W.B. Yeats) سے ہوئی۔ اس عظیم شاعر نے ان نظموں کو دیکھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا کہ ''پوری مغربی دنیا ٹیگور جیسے شاعر کا انتظار کر رہی ہے۔''

رابندر ناتھ کے اپنے ترجمہ کردہ مجموعۂ نظم ''گیتا نجلی'' پر انھیں 1913 میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ ٹیگور پہلے ایشیائی تھے جنھیں اس اعزاز سے نوازا گیا۔ انعام میں ملنے والی ساری رقم انھوں نے شانتی نکیتن کو دے دی۔ 1915 میں انھیں انگلستان میں 'سر' کا اعزاز بھی دیا گیا۔

ٹیگور ایک بین الاقوامی سطح کی یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے۔ اُن کا یہ خواب ''وشو بھارتی'' کے نام سے پورا ہوا۔ دسمبر 1918 میں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ کچھ مہینے بعد 1919 میں جلیاں والا باغ میں قتل عام کا واقعہ ہوا۔ احتجاج کے طور پر انھوں نے اپنا ''سر'' کا خطاب واپس کر دیا۔

'وشو بھارتی' کے قیام کے بعد رابندر ناتھ نے سارے ملک کا دورہ کیا۔ انھوں نے تمام ہندوستان میں وشو بھارتی کا پیغام پہنچایا اور لوگوں کو وہاں آنے کی دعوت دی۔ اس کے لیے انھوں نے کئی بیرونی ملکوں کا دورہ کیا اور وشو بھارتی کو متعارف کرایا۔ جب یہ یونیورسٹی اپنے پیروں پر کھڑی ہوگئی تو 1921 میں اسے قوم کے لیے وقف کر دیا گیا۔

مئی 1932 میں گاندھی جی ٹیگور سے ملے اور انھیں اپنے ''چرخہ پروگرام'' میں شمولیت کی دعوت دی۔ 1936 میں ٹیگور سخت بیمار ہوگئے۔ گاندھی جی تار کے ذریعے اُن کی خیریت معلوم کرتے رہتے تھے۔ 1940 میں وہ ایک بار اُن کی عیادت کے لیے کولکاتا بھی آئے۔ رابندر ناتھ نے گاندھی جی سے درخواست کی کہ وہ وشو بھارتی کی ذمے داری سنبھال لیں۔ اس پر گاندھی جی نے کہا کہ یہ قوم کا ادارہ ہے، اس کے لیے مجھ سے جو بن پڑے گا ضرور کروں گا۔

7 اگست 1941 میں رابندر ناتھ ٹیگور کا انتقال ہو گیا اور ہندوستان کی ترقی کا خواب دیکھنے والا ایک عظیم انسان دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا۔

(ادارہ)

© NCERT not to be republished

مشق

سوالات

1۔ رابندرناتھ ٹیگور کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی تھی؟

2۔ ٹیگور نے انگلستان کا پہلا سفر کس مقصد سے کیا تھا؟

3۔ بنکم چندر چٹرجی اور ٹیگور کی ملاقات کا حال لکھیے۔

4۔ مادری زبان میں تعلیم کے متعلق ٹیگور کی کیا رائے تھی؟

5۔ ٹیگور کو اُن کی کس تخلیق پر نوبل پرائز دیا گیا؟

© NCERT not to be republished